بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ طٰہٰ

آیاتہا ۱۳۵ ۲۰ سورۃ طٰہٰ مکیۃ ۴۵ رکوعاتہا ۸

سورۂ طٰہٰ تمام علماء کے نزدیک مکی ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ دارقطنی اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا(1) فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لٹکائے ہوئے نکلے تو انہیں بتایا گیا کہ تمہارا بہنوئی اور تمہاری بہن دین چھوڑ چکے ہیں۔ عمران کے پاس آئے ان کے پاس ایک مہاجر شخص تھا☆ جس کو خباب کہا جاتا تھا وہ سورۂ طٰہٰ تلاوت کر رہے تھے۔ عمر نے کہا: وہ کتاب مجھے دو جو تمہارے پاس ہے تا کہ میں اسے پڑھوں۔ عمر کتابیں پڑھتے تھے۔ عمر کو ان کی بہن نے کہا: تو ناپاک ہے اور اس قرآن کو صرف پاک ہی چھو سکتے ہیں تم اٹھو غسل کر دیا وضو کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور وضو کیا قرآن حکیم کو پکڑا اور پڑھا طٰہٰ۔ یہ ابن اسحاق نے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ عمر اپنی تلوار لٹکائے ہوئے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے انہیں نعیم بن عبداللہ ملے، اس نے پوچھا: اے عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر نے کہا: میں محمد کا ارادہ کر کے جا رہا ہوں جس نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے اور جس نے قریش کی جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اور قریش کے دانشوروں کو بیوقوف بنایا ہے اور ان کے دین پر عیب لگایا ہے اور ان کے معبودوں کو برا کہا ہے۔ پس میں اسے قتل کروں گا۔ نعیم نے اسے کہا: اللہ کی قسم! اے عمر تجھے تیرے نفس نے دھوکا دیا ہے کیا تجھے بنی عبد مناف زمین پر چلتا رہنے دیں گے جبکہ تو محمد کو قتل کر چکا ہوگا، کیا تو اپنے گھر والوں کی طرف نہیں جاتا تا کہ ان کا معاملہ سیدھا کرے؟ عمر نے پوچھا: میرے گھر والے؟ اس نے کہا: تیرا بہنوئی اور تیرے چچا کا بیٹا سعید بن زید اور تیری بہن فاطمہ بنت خطاب، اللہ کی قسم! دونوں اسلام قبول کر چکے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے پیروکار ہو چکے ہیں تجھے لازم ہے کہ ان کی خبر لو۔ عمر اپنے بہنوئی اور بہن کی طرف لوٹا ان کے پاس حضرت خباب بن ارت بھی تھے ان کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ تھی وہ ان دونوں کو پڑھا رہے تھے جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آمد محسوس کی تو حضرت خباب ان کی کوٹھری میں چھپ گئے یا کسی کمرے میں غائب ہو گئے۔ حضرت فاطمہ بنت خطاب نے صحیفہ پکڑا اور اپنی ران کے نیچے کر لیا۔ عمر نے حضرت خباب کی قرأت کو سن لیا جو ان دونوں کو پڑھا رہے تھے جب وہ گھر کے قریب ہوئے تھے جب داخل ہوئے تو پوچھا: جو میں نے مخفی آواز سنی ہے وہ کیسی تھی؟ سعید اور ان کی زوجہ نے کہا: تو نے کچھ نہیں سنا۔ عمر نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی پیروی شروع کر دی ہے عمر نے اپنے بہنوئی سعید بن زید کو پکڑ لیا۔ حضرت فاطمہ بنت خطاب اٹھی تا کہ اپنے خاوند کو عمر سے بچائیں عمر نے اسے بھی مار کر زخمی کر دیا۔ جب عمر نے ایسا کیا تو عمر کو اس کی بہن اور بہنوئی نے کہا: ہاں، ہم اسلام لا چکے ہیں اور

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، نہی عن المحدث عن مس القرآن، جلد 1، صفحہ 123

☆ جنہوں نے بعد میں ہجرت کی۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں جو تیرے جی میں آئے کر۔ جب عمر نے اپنی بہن کا خون دیکھا تو اپنے کیے پر شرمندہ ہوا اور پریشان ہوا اس نے اپنی بہن سے کہا: مجھے وہ صحیفہ دے جس کو پڑھتا ہوا میں نے تجھے سنا ہے میں دیکھوں کہ وہ کیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں عمر کاتب تھا جب اس نے یہ کہا تو اس کی بہن نے کہا: ہمیں تیرا خوف ہے کہ تو اس کی بحرمتی کرے گا۔ عمر نے کہا: تم خوف نہ کھاؤ، عمر نے اپنے خداؤں کی قسم اٹھائی کہ وہ صحیفہ واپس کر دے گا جب وہ پڑھ لے گا۔ جب عمر نے یہ کہا تو اس کو عمر کے اسلام لانے کی امید ہوگئی، بہن نے عمر سے کہا: اے میرے بھائی! تو اپنے شرک کی بنا پر نجس ہے اور اسے صرف پاک ہی چھو سکتا ہے۔ عمر اٹھا اور غسل کیا۔ بہن نے وہ صحیفہ عمر کو دے دیا اس میں سورۂ طہٰ لکھی ہوئی تھی۔ عمر نے اسے پڑھا اور بے ساختہ کہا: یہ کلام کتنا عمدہ اور خوبصورت ہے اور کتنا معزز ہے! جب حضرت خباب نے یہ سنا تو باہر نکل آئے اور کہا: اے عمر! اللہ کی قسم! میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ تجھے اپنے نبی کی دعا کے ساتھ خاص کر دے گا میں نے کل نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا مانگتے سنا ہے: اللھم أید الاسلام بأبی الحکم بن ھشام أو بعمر بن الخطاب (اے اللہ! ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ساتھ اسلام کی تائید اور قوت فرما) اللہ، اللہ اے عمر! اس وقت عمر نے کہا: اے خباب! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر میری راہنمائی کروتا کہ میں ان کے پاس جا کر اسلام قبول کرلوں۔

مسئلہ: دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے سورۂ طہٰ اور سورۂ یٰسین آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے پڑھی، جب ملائکہ نے قرآن سنا تو کہا: مبارک ہو اس امت کو جس پر یہ قرآن نازل ہوگا اور مبارک ہو ان سینوں کو جو اسے یاد رکھیں گے، مبارک ہو ان زبانوں کو جو اس کی تلاوت کریں گی''۔ ابن فورک نے کہا: اللہ تعالیٰ کے پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرشتوں میں سے جن کو اپنا کلام سمجھایا، سنایا اور ظاہر کیا۔ عرب کہتے ہیں: قرأت الشیٔ جب تو اس میں غور وفکر کرے اور عرب کہتے ہیں: ما قرأت ھذہ الناقۃ فی رحمھا سلی قط، یعنی اس اونٹنی کے رحم میں کبھی بچہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس بنا پر کلام آسان ہوگا۔ قرات سے مراد عبارات کا سمجھنا اور سنانا ہے جس کو تخلیق فرمایا اور لکھوانا ہے جس کو بیان فرمایا ہے۔ ہمارے قول: قرأنا کلام اللہ کا یہی مفہوم ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (المزمل: 20) اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (المزمل: 20) کا یہی معنی ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے بعض نے کہا کہ قرء کا معنی ہے تکلم بہٖ اور یہ مجاز ہے جیسے ان کا قول ہے: ذقت ھذا القول ذواقا، اس کا معنی ہے میں نے اس کو آزمایا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (النحل) یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے ساتھ آزمایا۔ اس کو ذواق کہا گیا۔ خوف حقیقت میں چکھا نہیں جاتا کیونکہ ذوق حقیقت میں منہ کے ساتھ ہوتا ہے، دوسرے جوارح سے نہیں ہوتا۔ ابن فورک نے کہا: جو ہم نے پہلے کہا وہ اس خبر کی تاویل میں اصح ہے کیونکہ اللہ کا کلام ازلی ہے، قدیم ہے، جملہ حوادث سے پہلے ہے۔ اس نے اپنی مخلوق میں سے جس کو جس وقت چاہا سنایا اور سمجھایا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے کلام کا عین مدت اور زمانہ کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔

طٰهٰ ۝ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ

خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلَى ۝ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝

''طا۔ ھا۔ نہیں اُتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں۔ بلکہ یہ نصیحت ہے اس کے واسطے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے۔ یہ اُتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا فرمایا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ بے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا، اُسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ اور تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور بھیدوں کو بھی۔ الله (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے اس کے لیے بڑے خوبصورت نام ہیں''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: طٰهٰ ۝ اس کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت سیدنا ابوبکر رضی الله عنہ نے کہا: یہ اسرار میں سے ہے؛ غزنوی نے یہ ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے یا رجل (اے شخص) یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: عکل قبیلہ کی معروف لغت ہے۔ بعض نے فرمایا: عک قبیلہ کی لغت ہے۔ کلبی نے کہا: اگر عک قبیلہ کے کسی شخص کو یا رجل کہے گا تو جواب نہیں دے گا حتی کہ تو طہ کہے۔ طبری نے اس کے متعلق ایک شعر لکھا ہے:

دعوت بطٰهَ في القتال فلم يُجِبْ　　فخفتُ عليه أن يكون مُوائِلا (1)

اس شعر میں موئلا کی جگہ مزایلا بھی مروی ہے۔ عبدالله بن عمرو نے کہا: عک قبیلہ کی لغت میں اس کا معنی ہے یا حبیبی، اے میرے حبیب!۔ یہ قول غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ قطرب نے کہا: یہ طی قبیلہ کی لغت ہے۔ یزید بن مہلہل نے کہا:

إنّ السَّفاهةَ طٰهَ من شمائلكم　　لابارك الله في القوم المَلَاعِين

اسی طرح حسن نے کہا کہ طہ کا معنی یا رجل ہے؛ یہی عکرمہ کا قول ہے۔ سریانی زبان میں بھی اسی طرح ہے؛ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ یہ ماوردی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے حکایت کیا ہے۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ نبطی زبان میں اس کا معنی یا رجل ہے، یہ سدی، سعید بن جبیر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

إن السفاهة طه من خلائقكم　　لاقدّس الله أرواح الملاعين(2)

عکرمہ نے بھی یہ کہا ہے کہ حبشی زبان میں یا رجل کی طرح ہے؛ یہ قول ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگرچہ دوسری لغات میں بھی یہ لفظ ہے لیکن یہ عربی لغت سے بھی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، یہ عک، طی اور عکل میں یمنی لغت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الله تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور قسم ہے۔ اس کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے؛ یہ بھی حضرت ابن

1۔ تفسیر طبری، جز 16، صفحہ 158　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 392

عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے جس طرح کہ محمد نام بھی اس نے رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میرے رب کی بارگاہ میں دس اسماء ہیں'' ان میں طٰہٰ اور یٰسین کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سورت کا نام ہے اور اس کے لیے چابی ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کلام سے اختصار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کے علم کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حروف مقطعات ہیں ہر لفظ ایک خاص معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: طا سے مراد شجرہ طوبیٰ ہے اور ھا سے مراد النار الھاویۃ ہے۔ عرب کسی چیز کو اس کے جز سے تعبیر کر دیتے ہیں گویا جنت اور دوزخ کی قسم اٹھائی۔ سعید بن جبیر نے کہا: طا اللہ تعالیٰ کے اسم طاہر اور طلب کا اعادہ ہے اور ھا اللہ تعالیٰ کے اسم ھادی کا آغاز ہے۔ بعض نے فرمایا: طا سے مراد ہے اے امت کی شفاعت کے حریص! ھا سے ھادی الخلق الی اللہ کا معنی مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: طا طہارت سے ہے اور ھا ہدایت سے ہے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: یاطاھرًا من الذنوب یاھادی الخلق إلی علام الغیوب (اے گناہوں سے مبرا! اے مخلوق کی علام الغیوب کی طرف راہنمائی کرنے والے) بعض نے فرمایا: طا سے مراد طبل جنگ ہے اور ھا سے مراد ان کی ہیبت ہے جو کافروں کے دلوں میں ڈالی جاتی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے: سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران: 181) اور فرمایا: وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (الاحزاب: 26) بعض نے فرمایا: طا سے مراد اہل جنت کا جنت میں خوش ہونا ہے اور ھا سے مراد یہ ہے کہ دوزخی دوزخ میں ذلیل ہوں گے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ طٰہٰ کا معنی ہے مبارک ہے اس کو جس نے ہدایت پائی یہ مجاہد اور محمد بن حنفیہ کا قول ہے۔ ساتواں قول یہ ہے کہ طٰہٰ سے مراد طاء الأرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشقت برداشت کرتے تھے حتیٰ کہ پاؤں مبارک سوج جاتے تھے اور پاؤں متورم ہو جاتے تھے اور اپنے قدموں کے درمیان آرام کرنے کی احتیاج محسوس ہوتی تو آپ کو کہا گیا: طاء الارض یعنی آپ تھکیں نہیں کہ آپ کو آرام کی حاجت ہو، یہ انباری نے حکایت کیا ہے۔ قاضی عیاض نے ''الشفاء'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ربیع بن انس نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ نے طٰہٰ نازل فرمایا۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر دوسرا پاؤں بھی رکھو۔ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤی، زمخشری نے کہا: حسن سے مروی ہے طٰہٰ اور اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ الوطاء سے امر کا صیغہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد میں ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے تھے تو آپ کو حکم دیا گیا کہ دونوں پاؤں اکھٹے زمین پر رکھو یہ اصل میں طأتھا ہمزہ کو ہ سے بدل دیا گیا جیسا کہ یطأمیں الف سے بدل دیا گیا۔ یہ اس کے بارے میں ہے جس نے کہا: لاھناك المرتع پھر اس پر یہ امر بنایا گیا اور ھاء سکت کے لیے ہے۔ مجاہد نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رات کے وقت قیام کے لمبا ہونے کی وجہ سے نماز میں اپنے سینوں میں رسیاں باندھتے تھے پھر فرضی نماز کے ساتھ اس کو منسوخ کر دیا گیا، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ کلبی نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں وحی نازل ہوئی تو آپ نے عبادت میں بہت زیادہ کوشش کی اور عبادت میں شدت کی اور ساری رات قیام فرماتے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے نفس پر تخفیف کرنے کا حکم دیا پھر آپ نماز بھی پڑھتے تھے اور آرام بھی

کرتے تھے۔ پھر اس آیت نے رات کے قیام کو منسوخ کر دیا اس آیت کے بعد آپ نوافل بھی پڑھتے تھے اور سوتے بھی تھے۔ مقاتل اور ضحاک نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو کفار قریش کہتے: یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اس لیے نازل ہوا ہے تا کہ آپ کو مشقت میں ڈالے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا: طٰهٰ ۞ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۞ یعنی ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ تھکیں، جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس بناء پر طٰه اصل میں طاھا ہوگا یعنی طا الأرض ضمیر کا مرجع الارض ہوگا یعنی اپنی نمازوں میں اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھو۔ ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور وہ الف ساکن ہوگا۔ ایک جماعت نے طَهٰ پڑھا ہے۔ اس کی اصل طَأْ ہے اس کا معنی طأ الأرض ہے۔ ہمزہ کو حذف کیا گیا اور ھاء السکت داخل کی گئی۔ زر بن جیش نے کہا: ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود پر طَهٰ پڑھا تو حضرت عبداللہ نے اسے فرمایا: طِهِ ہے۔ فرمایا: اے ابوعبدالرحمٰن! کیا یہ حکم نہیں دیا گیا کہ زمین کو اپنے دونوں پاؤں کے ساتھ روندو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: طِهِ، مجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح پڑھایا تھا۔ ابوعمر، ابواسحاق نے ھا کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور طا کو فتح دیا ہے۔ ابوبکر، حمزہ، کسائی اور اعمش نے دونوں میں امالہ کیا ہے۔ ابوجعفر، شیبہ اور نافع نے دونوں کو دونوں لفظوں کے بین بین پڑھا ہے۔ ابوعبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور باقی قراء نے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ تمام لغات صحیح اور فصیح ہیں۔ نحاس نے کہا: اکثر اہل عرب کے نزدیک دو وجوہ کی بنا پر امالہ کی کوئی وجہ نہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے یہاں نہ یا ہے اور نہ کسرہ تا کہ امالہ ہوتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ طا ان حروف میں سے ہے جو امالہ کے مانع ہیں۔ یہ دونوں علتیں واضح ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۞ یہ مانُزِلَ علیك القرآن لتشقیٰ بھی پڑھا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: بعض نحویوں نے کہا یہ لام نفی ہے۔ بعض نے کہا: لام جحود ہے۔ ابوجعفر نے کہا: میں نے ابوالحسن بن کیسان کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لام جارہ ہے اس کا معنی ہے: ما انزلنا علیك القرآن للشقاء، الشقاء مد اور قصر کے ساتھ ہے یہ واوی ہے، الشقاء کا لغوی معنی تھکن اور مشقت ہے یعنی آپ کی مشقت کے لیے تو ہم نے آپ پر قرآن نازل نہیں کیا۔ شاعر نے کہا:

ذوالعقل یشقی فی النعیم بعقله   وأخو الجهالة فی الشقاوة ینعم

پس لِتَشۡقٰٓى کا معنی ہے تا کہ آپ تھکیں ان پر فرط تاسف کی بنا پر کہ وہ ایمان لے آئیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ (الکہف:6)

یعنی آپ کے ذمہ صرف تبلیغ کرنا اور نصیحت کرنا ہے اور ان کا ایمان لانا آپ پر فرض نہیں کیا گیا اس کے بعد کہ آپ نے رسالت اور موعظہ حسنہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ روایت ہے کہ ابوجہل (لعنۃ اللہ علیہ) اور نضر بن حارث نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ شقی ہیں کیونکہ آپ نے اپنے آباء کا دین ترک کر دیا ہے پس اس کا رد کیا گیا ہے کہ دین اسلام اور یہ قرآن تو ہر کامیابی کا زینہ ہے اور ہر سعادت کے حصول کا سبب ہے اور جس نظریہ پر کفار ہیں وہ نری شقاوت ہے۔ مذکورہ اقوال کی بنا پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نوافل پڑھتے تھے حتی کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے تھے۔ جبریل نے کہا: حضور! اپنے نفس

پر شفقت کریں بیشک اس کا بھی آپ پر حق ہے یعنی ہم نے آپ پر قرآن نازل نہیں کیا تا کہ آپ کا نفس عبادت میں تھک جائے اور تکلیف و مشقت میں آپ اسے مبتلا کریں آپ کو تو آسان شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ تشقی سے بدل ہے یعنی ما انزلناہ إلا تذکرۃ اور نحاس نے کہا: یہ وجہ بہت بعید ہے۔ ابوعلی نے اس کا انکار کیا ہے کیونکہ تذکرۃ، شقاء نہیں ہے۔ یہ مصدر کی بناء پر منصوب ہے یعنی أنزلناہ لتذکر بہ تذکرۃ یا مفعولہ لاجلہ کی بنا پر منصوب ہے یعنی مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ ماأنزلناہ إلا لتذکرۃ۔ حسین بن فضل نے کہا: اس میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی ما أنزلنا علیك القرآن إلا تذکرۃ لمن یخشیٰ ولئلا تشقی اور تنزیلا مصدر ہے یعنی نزلناہ تنزیلا، بعض نے فرمایا: یہ تذکرۃ کے قول سے بدل ہے۔ ابو حیوہ شامی نے تنزیل مرفوع پڑھا ہے۔ اس معنی کی بناء پر ھذا تنزیل۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝، العلاء سے مراد بلند و بالا ہے یہ العلیا کی جمع ہے جیسے کبریٰ وصغریٰ، کُبَرْ، صُغَر اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں اپنی عظمت وجبروت اور جلال کی خبر دی ہے۔ پھر فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اس پر مدح کی بنا پر نصب جائز ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: بدل کی بنا پر جر ہے۔ سعید بن مسعدہ نے کہا: رفع ھو الرحمٰن کے معنی کی بنا پر ہے۔ نحاس نے کہا: رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور اس کی خبر لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ہے۔ پس استویٰ پر وقف نہ ہوگا اور خلق میں جو ضمیر مضمر ہے اس سے بدل کی بنا پر مرفوع ہو تو اس صورت میں استویٰ پر وقف جائز ہوگا اسی طرح جب مبتدا محذوف کی خبر کی بنا پر مرفوع ہوگا تو العلاء پر وقف نہ ہوگا۔ الإستویٰ کے معنی پر گفتگو سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔ شیخ ابو الحسن وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بغیر حد وکیف کے اپنے عرش پر مستوی ہے جیسا کہ مخلوق کا استوا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پیدا کیا جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اور جو کچھ قیامت کے بعد ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝، تَحْتَ الثَّرٰى سے مراد یہ ہے کہ اس چٹان کے نیچے جو کچھ ہے جس کے نیچے والی چیزوں کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ محمد بن کعب نے کہا: اس سے مراد ساتویں زمین ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی پانی پر ہے اور اس مچھلی کی دونوں طرفیں سر اور دُم عرش کے نیچے ملتی ہیں اور سمندر سبز چٹان پر ہے اور آسمان کا سبزہ اس وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس کے متعلق ارشاد ہے: فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ (لقمان: 16) اور وہ چٹان بیل کے سینگ پر ہے اور وہ بیل الثریٰ پر ہے۔ اور ثریٰ کے نیچے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا☆۔ وہب بن منبہ نے کہا: سطح زمین پر سات سمندر ہیں اور زمینیں سات ہیں اور ہر دو زمینوں کے درمیان ایک سمندر ہے اور نیچے والا سمندر جہنم کے کنارے سے ملا ہوا ہے۔ اگر سمندر کی بڑائی،

☆ علامہ سید محمود آلوسی رقم طراز ہیں میرے نزدیک اس قسم کی روایات کا موضوع ہونا اقوی ہے۔ ابن قیم نے المنار المنیف جلد 1 صفحہ 78 میں لکھا ہے اس قسم کی فضول مرویات کے نقل کرنے والوں پر تعجب ہوتا ہے۔

پانی کی کثرت اور اس کی ٹھنڈک نہ ہوتی تو جہنم ہر اس چیز کو جلا دیتی جو کچھ اس کے اوپر ہے۔ فرمایا: جہنم ہوا کے متن پر ہے اور ہوا کا متن تاریکی کے پردے پر ہے اس کی موٹائی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ حجاب الثریٰ پر ہے اور الثریٰ تک خلائق کے علم کی انتہا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: السر اسے کہتے ہیں جو انسان آہستہ طور پر بیان کرتا ہے اور اخفی سے مراد وہ ہے جو انسان دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور اسے دوسرے کے سامنے بیان نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ السر سے مراد دل کی بات ہے اور اخفی سے مراد وہ ہے جسے تیرا نفس بیان کرتا ہے جو ابھی موجود نہیں ہے جبکہ وہ بعد میں ہوگا اور تو اسے جانتا ہے تو اپنے نفس سے آج بیان کرتا ہے اور کل کے متعلق جو بیان کرتا ہے اسے تو نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو تو آج آہستہ سے سوچتا ہے اور جو تو کل سوچے گا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رازوں اور بھیدوں کو جانتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: السر سے مراد وہ ہے جو ابن آدم اپنے دل میں آہستہ سے کہتا ہے اور اخفی سے مراد وہ ہے جو ابن آدم پر مخفی ہوتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے لیکن انسان اسے نہیں جانتا۔ اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم ماضی اور مستقبل کے بارے میں برابر ہے اس کے علم میں تمام مخلوق ایک نفس کی طرح ہے۔ قتادہ وغیرہ نے کہا: السر سے مراد وہ ہے جو انسان اپنے نفس میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور اخفی وہ ہوتا ہے جو نہ ہوتا ہے اور نہ اسے کوئی چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ ابن زید نے کہا: السر سے مراد خلائق کے راز ہیں اور اخفی سے مراد اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ طبری نے اس کا انکار کیا ہے (1) فرمایا: اخفی وہ ہے جو انسان کے راز میں نہیں ہے وہ آئندہ اس کے نفس میں آئے گا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۝ اللہ اسم جلالت پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے یا مبتدا کے اضمار کی وجہ سے ہے یا یَعْلَمُ میں جو ضمیر ہے اس سے بدل کی بنا پر ہے۔ اس نے اپنی توحید خود بیان فرمائی ہے یہ اس طرح ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی طرف دعوت دی تو انہیں یہ گراں گزری۔ ابوجہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو الرحمٰن کا ذکر کرتے ہوئے سنا تو اس نے ولید بن مغیرہ کو کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں تو اللہ کے ساتھ دوسرے خدا کو پکارنے سے منع کرتا ہے اور خود وہ اللہ تعالیٰ اور الرحمٰن کو پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی اور یہ نازل فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل: 110) اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کے اسماء کثیر ہیں۔ پھر فرمایا: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۝ سورۃ الاعراف میں اسماء حسنیٰ پر تنبیہ گزر چکی ہے۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰی ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی ۝ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ؕ ۝ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ؕ ۝ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 162

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿١٣﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ
لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿١٥﴾ فَلَا
يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾

''اور (اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو اطلاع موسیٰ کے قصہ کی۔ جب (مدین سے واپسی پر تاریک رات میں) آپ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں کو کہا: تم (ذرا یہاں) ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں لے آؤں تمہارے لیے اس سے کوئی چنگاری یا مجھے مل جائے آگ کے پاس کوئی راہ دکھانیوالا۔ پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی: اے موسیٰ! بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں پس تو اُتار دے اپنے جوتے بیشک تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے۔ اور میں نے پسند کر لیا ہے تجھے (رسالت کے لیے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے۔ یقیناً میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود میرے سوا پس تو میری عبادت کیا کر اور ادا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لیے۔ بیشک وہ گھڑی (قیامت) آنے والی ہے میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تا کہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو اس کام کا جس کے لیے وہ کوشاں ہے۔ پس ہرگز نہ روکے تجھے اس (کو ماننے) سے وہ شخص جو نہیں ایمان رکھتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿٩﴾ اہل معانی نے کہا: یہ استفہام اثبات و ایجاد ہے اس کا معنی ہے أليس قد أتاك؟ کیا تیرے پاس نہیں آئی موسیٰ کے واقعہ کی اطلاع؟ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے قد أتاك (آچکی ہے تیرے پاس)؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: اس کا معنی ہے ابھی تک موسیٰ کے واقعہ کی اطلاع نہیں آئی۔ پھر اس کے متعلق خود خبر دی۔ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا: یہ اس وقت ہوا جب آپ کی خدمت کرنے کی مدت پوری ہوئی اور آپ اپنی اہلیہ کو لے کر چلے۔ آپ مدین سے مصر کی طرف آرہے تھے اور آپ راستہ بھول گئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک غیور شخص تھے رات کے وقت لوگوں کے ساتھ چلتے تھے اور دن کے وقت غیرت کی وجہ سے جدا ہو جاتے تھے تا کہ لوگ آپ کی زوجہ کو نہ دیکھیں پس آپ ساتھیوں سے جدا ہو کر راستہ بھول گئے؛ کیونکہ علم الٰہی میں ایسا فیصلہ ہو چکا تھا رات تاریک تھی۔ مقاتل نے کہا: جمعہ کی رات تھی سردیوں کا موسم تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اپنی والدہ کی طرف واپس جانے کی اجازت طلب کی تو انہیں اجازت دی گئی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر والوں اور اپنی بکریوں کے ساتھ چل پڑے۔ ٹھنڈی رات میں راستہ میں آپ کا بچہ پیدا ہوا جبکہ آپ راستہ سے ہٹ چکے تھے اور ان کی بکریاں بھی بکھر چکی تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ جلائی لیکن آگ نہ جلی پس آپ نے راستہ کی بائیں جانب دور سے آگ دیکھی تو آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا: تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب آپ آگ کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے عناب کے درخت میں آگ دیکھی اس روشنی کی

خوبصورتی سے تعجب کرتے ہوئے آپ ٹھہر گئے اس درخت کے سبزہ کی شدت اتنی تھی کہ آگ کی گرمی کی شدت اس درخت کی سبزی کے حسن کو تبدیل نہ کر سکے اور درخت کے پانی کی کثرت اور سبزہ کی شادابی نے آگ کی روشنی کے حسن کو تبدیل نہیں کیا تھا؛ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ کو دیکھا، جیسا کہ روایت میں ہے: ''یہ علیق (وہ گھاس جو درخت پر لپٹتی ہے اور اس کا پھل شہتوت کی طرح ہوتا ہے) کا درخت تھا آپ نے اس کا قصد کیا تو وہ آپ سے پیچھے ہو گیا پس آپ لوٹ آئے اور اپنے اندر خوف محسوس کیا پھر وہ درخت قریب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس درخت سے کلام فرمائی''۔ ماوردی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک آگ تھی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نور تھا(1)۔ حمزہ نے لاھله امکثوا، ھاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح سورۃ القصص میں پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ اس کی لغت پر ہے جس نے کہا: مورت بھُو یا رجل، وہ اصل پر لایا یہ جائز ہے مگر حمزہ نے دونوں جگہ اس کی اصل کی مخالفت کی۔ امکثوا فرمایا اقیموا، نہیں فرمایا کیونکہ اقامۃ دوام کا تقاضا کرتا ہے، المکث ایسا نہیں ہے۔ آنست کا معنی ہے ابصرت؛ یہ ابن اعرابی کا قول ہے؛ اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا (النساء: 6)

آنست الصوت میں نے آواز کو سنا۔ القبس آگ کا شعلہ، اسی طرح المقباس ہے۔ کہا جاتا ہے: قبست منه نارا، واقتبست منه علماً، یعنی میں نے اس سے استفادہ کیا۔ یزیدی نے کہا: اقبست الرجل علما و قبستهٗ نارا میں نے اس سے علم حاصل کیا اور میں نے اس سے آگ حاصل کی۔ اگر تو اس کے لیے آگ طلب کرے تو تو کہے گا: اقبستهٗ کسائی نے کہا: اقبستهٗ نارا او علماً برابر ہے۔ قبسته دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ هُدًى سے مراد ھادیا (راہنما) ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا جب آپ اس آگ کے پاس آئے نُوْدِیَ تو درخت سے آواز دی گئی جیسا کہ سورۃ القصص میں ہے یعنی اس کی جہت سے آواز آئی جیسا کہ آگے آئے گا۔ یٰمُوْسٰى ۞ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۞ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی اس دن موسیٰ علیہ السلام پر صوف کا کمبل تھا صوف (اون) کا جبہ تھا اور صوف کی ٹوپی تھی اور صوف کی شلوار تھی اور آپ کے جوتے مردار گدھے کے چمڑے کے تھے''(2)۔ ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صرف حمید الاعرج کے طریق سے جانتے ہیں۔ حمید یہ علی کوفی کا بیٹا ہے۔ اور یہ منکر الحدیث ہے اور حمید بن قیس الاعرج المکی جو مجاہد کا ساتھی ہے وہ ثقہ ہے۔ الکمۃ، چھوٹی ٹوپی کو کہتے ہیں۔ عام قراء نے انی کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ أی نودی فقیل له یا موسیٰ إنی: ابو عبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ ابو عمرو، ابن کثیر، ابن محیصن اور حمید نے انی نداء کے اعمال کی وجہ سے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جوتے اتارنے کے حکم کا سبب کیا تھا۔ الخلع کا معنی ہے اُتارنا۔ النعل اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین سے پاؤں کو بچانے کے لیے بنائی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 395
2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی لبس الصوف، حدیث نمبر 1656، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جوتے اتارنے کا حکم اس لیے دیا کیونکہ وہ ناپاک تھے، غیر مذبوح جلد سے بنے ہوئے تھے؛ یہ کعب، عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس لیے یہ حکم دیا تا کہ مقدس وادی کی برکت کو حاصل کریں اور آپ کے قدم وادی کی مٹی کو مس کریں؛ یہ حضرت علی بن ابی طالب، حسن اور ابن جریج کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ کی بارگاہ میں تواضع اور خشوع کا اظہار کرنے کے لیے جوتے اُتارنے کا حکم دیا اسی طرح سلف صالحین کرتے ہیں جب وہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس جگہ کی تعظیم کرنے کے لیے یہ حکم دیا جیسا کہ حرم کی تعظیم کے لیے جوتوں کے ساتھ داخل نہیں ہوا جاتا عرف یہ ہے کہ بادشاہوں کی بارگاہ میں حاضری کے وقت جوتے اُتارے جاتے ہیں اور انسان حد درجہ تواضع کا اظہار کرتا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی وجہ سے یہ حکم دیا گیا اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ وہ مردار کے چمڑے سے بنے ہوئے تھے یا کسی اور چیز سے بنے ہوئے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ میں سوار نہیں ہوتے تھے وہ اس مٹی کا احترام کرتے تھے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسم اقدس موجود تھا اس معنی (تعظیم) کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بشیر بن خصاصیہ کو فرمایا تھا جبکہ وہ جوتوں کے ساتھ قبور کے درمیان چل رہے تھے: ”جب تو ایسی جگہ پر ہو تو اپنے جوتے اتار دے“(1)۔ حضرت بشیر فرماتے ہیں: میں نے جوتے اتار دیے۔ پانچواں قول یہ ہے: یہ اہل، اولاد سے دل کو فارغ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ کبھی اہل کو نعل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خواب کی تعبیر میں یہ اس طرح ہے جو خواب دیکھے کہ وہ جوتے پہننے والا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نور اور ہدایت کی بساط بچھائی تھی تو رب العالمین کی بساط کو جوتوں کے ساتھ روندنا مناسب نہیں تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اُتارنے کا حکم دیا گیا ہو۔ یہ ان پر پہلا فرض تھا جیسا کہ سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا گیا: قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۝ وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ ۝ وَالرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ۝ (المدثر) حقیقی مراد اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ خبر میں ہے: ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جوتے اتارے اور انہیں وادی کے پیچھے پھینک دیا“۔ ابوالاحوص نے کہا: حضرت عبد اللہ، حضرت ابوموسیٰ سے ان کے گھر میں ملے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت ابوموسیٰ نے تکبیر کہی اور حضرت ابوموسیٰ نے حضرت عبد اللہ سے کہا: آگے بڑھو (اور امامت کراؤ) حضرت عبد اللہ نے کہا: تم آگے بڑھو تم اپنے گھر میں ہو۔ تو حضرت ابوموسیٰ آگے بڑھے اور اپنے جوڑے اتار دیے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: کیا تم وادی مقدس میں ہو (کہ تم نے جوتے اُتار دیے ہیں) صحیح مسلم میں سعید بن یزید سے مروی ہے فرمایا: میں نے حضرت انس سے کہا: کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعلین میں نماز پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا: ہاں (2)۔ اس حدیث کو امام نسائی نے حضرت عبد اللہ بن سائب سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنے جوڑے اپنی بائیں طرف رکھ دیے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوسعید کی حدیث سے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 167

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جواز الصلوٰۃ فی النعلین، جلد 1، صفحہ 208

سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ باب الصلوٰۃ فی النعل، حدیث نمبر 553، معنی کے اعتبار سے، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی جب کہ آپ نے اپنے جوڑے اتار دیے تھے اور انہیں اپنی بائیں جانب رکھا تھا جب لوگوں نے یہ دیکھا تو اپنے جوتے اتار دیے، جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مکمل فرمائی تو فرمایا: ''تمہیں کس چیز نے جوتے پھینکنے پر اُبھارا ہے؟'' صحابہ نے عرض کی: ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے جوتے اتار دیے ہیں تو ہم نے اپنے جوتے اتار دیے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل میرے پاس آئے اور مجھے بتایا کہ ان میں غلاظت لگی ہوئی ہے'' فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو اسے دیکھنا چاہیے جب اپنے جوتے میں کوئی غلاظت وغیرہ دیکھے تو اسے صاف کر دینا چاہیے اور پھر ان میں نماز پڑھنی چاہیے'' (1)۔ ابو محمد عبدالحق نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے کہ یہ حدیث دونوں قسم کی احادیث کو جمع کرتی ہے اور ان کے درمیان تعارض کو اٹھا دیتی ہے۔ علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز نعلین میں جائز ہے جب وہ ہر قسم کی غلاظت سے پاک ہوں حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: جوتوں میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: 31) کا یہی مفہوم ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابراہیم نخعی نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا جو جوتے اتارتے ہیں: میں خواہش کرتا ہوں کہ کوئی محتاج آئے اور ان کو اٹھا کر لے جائے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اگر تو جوتوں کو اتارے تو اپنے قدموں کے درمیان اتار کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو وہ اپنے قدموں کے درمیان جوتے اُتارے'' (2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مقبری سے کہا: اپنے جوتے اپنے قدموں کے درمیان اُتار دے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کو اذیت نہ دے۔ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوتے بائیں جانب اتارے کیونکہ آپ امام تھے۔ جب تو امام ہو یا اکیلا ہو تو ایسا کرلے اگر تو چاہے اور اگر تو صف میں مقتدی ہو تو اپنے جوتوں کے ساتھ اپنی بائیں طرف والوں کو اذیت نہ دے اور نہ انہیں اپنے سامنے رکھ تا کہ وہ تجھے اپنی طرف مشغول رکھیں گے لیکن اپنے قدموں کے آگے رکھ۔ جبیر بن مطعم سے مروی ہے فرمایا: انسان کا اپنے قدموں کے درمیان جوتے رکھنا بدعت ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر جوتوں میں ایسی نجاست لگی ہوئی ہو جس کی ناپاکی پر علماء کا اجماع ہے جیسے خون اور غلاظت مثلاً بنی آدم کا پیشاب وغیرہ تو انہیں پانی کے ساتھ دھونا ہی پاک کرے گا؛ یہ امام شافعی اور اکثر علماء کی رائے ہے۔ اگر نجاست ایسی ہو جس میں اختلاف ہے جیسے جانوروں کا پیشاب اور تر گوبر تو اس میں اختلاف ہے کہ جوتے اور موزے کو مٹی پر رگڑنا اسے پاک کر دے گا یا نہیں۔ ہمارے نزدیک دو قول ہیں: امام اوزاعی اور ابو ثور نے بغیر کسی تفصیل کے اسے مٹی پر رگڑنے کو جائز قرار دیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: جب وہ خشک ہو تو اسے کھرچ دینا اور رگڑ دینا بھی زائل کر دے گا اور جب وہ تر ہوگی تو اسے دھونا ہی زائل کرے گا سوائے پیشاب کے۔ ان کے نزدیک اس میں دھونا ہی ضروری ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: ان میں سے کسی چیز کو پاک نہیں کرے گا مگر پانی۔ صحیح قول اس کا ہے جس نے کہا ہے: رگڑنا جوتے اور موزے کو پاک کر دے گا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، الصلوٰۃ فی النعال، جلد 1، صفحہ 95

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، المصلی اذا خلع نعلیہ این یضعھما، جلد 1، صفحہ 96

کیونکہ حضرت ابوسعید کی حدیث ہے کہ اگر نعل اور خف مردار کی جلد سے بنے ہوئے ہوں اگر وہ غیر مدبوغ ہوگی تو وہ بالاتفاق نجس (ناپاک) ہے سوائے اس قول کے جس کی طرف زہری کا رجحان ہے اور لیث کا خیال ہے جیسا کہ سورۃ النحل میں گزر چکا ہے۔ اور نجاست کے زائل کرنے کا قول سورۂ برأت میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ ، الْمُقَدَّسِ سے مراد مطہر ہے، القدس کا معنی طہارت ہے۔ الأرض المقدسہ سے مراد پاک زمین ہے۔ اس کو مقدس اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں سے کافروں کو نکال دیا تھا اور مومنین کو آباد کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات کو بعض پر فضیلت دی ہے جس طرح کہ بعض اوقات کو بعض پر فضیلت دی ہے اسی طرح بعض حیوانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے کہ جسے چاہے فضیلت دے دے۔ اس بنا پر کافروں کے نکالنے اور مومنین کے ٹھہرانے کی وجہ سے مقدس ہونے کا اعتبار نہ ہوگا دوسری وجہ بھی اس میں شریک ہے۔ طُوًى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہ سے مروی ہے کہ یہ وادی کا نام ہے(1)۔ ضحاک نے کہا: یہ عمیق گہری، گول وادی ہے جیسے کوئی لپٹی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ عکرمہ نے اسے طوی پڑھا ہے باقی قراء نے طُوًى پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا: طوی شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔ طا کو کسرہ اور ضمہ دیا جاتا ہے۔ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جنہوں نے اسے منصرف بنایا ہے انہوں نے اسے وادی کا اسم اور اسے نکرہ بنایا ہے اور جنہوں نے اسے غیر منصرف بنایا ہے انہوں نے اسے بلدہ اور بقعہ بنایا ہے اور اسے معرفہ بنایا ہے۔ بعض نے فرمایا: طُوی، طِوًی کی مثل ہے۔ لپٹی ہوئی چیز، انہوں نے الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ کے بارے میں کہا: وہ دو مرتبہ پاک کی گئی۔ حسن نے کہا: اس میں دو مرتبہ برکت اور تقدیس رکھی گئی۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کو طوی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وادی کو رات کے وقت طے کیا تھا۔ یہ مصدر ہے اس میں وہ عامل ہے جو اس کے لفظ سے نہیں گویا یوں کہا: إنك بالوادی المقدس الذی طویتہ طوی، یعنی آپ نے اپنے چلنے کے ساتھ اس کو طے کیا۔ حسن نے کہا اس کو دو مرتبہ پاک کیا گیا۔ یہ طویتہ طوی سے مصدر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ یعنی میں نے تجھے رسالت کے لیے چن لیا۔ اہل مدینہ ابو عمرو، عاصم اور کسائی نے وأنا اخترتك پڑھا ہے اور حمزہ نے انا اخترناك پڑھا ہے، دونوں کا معنی ایک ہے لیکن یہاں أنا اخترتك دو اعتبار سے اولیٰ ہے ایک یہ کہ خط کے اعتبار سے یہ مناسب ہے، دوسرا یہ کہ نسق کلام کے اعتبار سے یہ اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰمُوْسٰی ۝ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ، اس نسق کے اعتبار سے متکلم کا صیغہ آئے گا؛ یہ نحاس کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ۝ اس میں ایک مسئلہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(2): مجھے میرے والد صاحب نے بتایا فرمایا میں نے ابو الفضل جوہری رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا: فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی تو آپ پتھر پر ٹھہر گئے اور ایک پتھر کے ساتھ ٹیک لگائی اور اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور اپنی ٹھوڑی اپنے سینے پر رکھی اور ٹھہر کر

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 170　2۔ المحرر الوجیز، جلد 4، صفحہ 39

سننے لگے اور آپ کا لباس اون کا تھا۔

میں کہتا ہوں: حسن استماع واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مدح فرمائی فرمایا: الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ (الزمر: 18)

اور اس وصف کے خلاف کی مذمت کی ہے فرمایا: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ (بنی اسرائیل: 47)

حضور عقل کے ساتھ کلام کو سننے کے لیے خاموش رہنے والے کی مدد فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ادب سکھانے کے لیے اس کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف) اور یہاں فرمایا: فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى کیونکہ اس طرح اللہ کی طرف سے سمجھ ملتی ہے۔ وہب بن منبہ سے مروی ہے فرمایا: سننے کے آداب میں سے یہ ہے کہ اعضاء میں سکون ہو آنکھیں جھکی ہوئی ہوں اور توجہ سے سننا اور عقل کا حاضر ہونا اور عمل کرنے کا عزم کرنا۔ وہ استماع جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے جوارح کو روکے کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہو کہ اس کا دل اس سے غافل ہو جائے جسے وہ سن رہا ہے اور اپنی نگاہ کو جھکا کر رکھے اور دل کو کسی نظر آنے والی چیز سے غافل نہ کرے اور اپنے عمل کو حاضر رکھے اور جو سن رہا ہے اس کے سوا کسی چیز کو دل میں نہ لائے۔ سمجھنے کا عزم کرے اور جو سمجھے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کرے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: علم کا آغاز غور سے سننا ہے، پھر سمجھنا پھر یاد کرنا ہے، پھر عمل کرنا اور پھر آگے پھیلانا ہے جب انسان کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سچی نیت سے اس طرح سنتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور اس کے لیے اس کے دل میں نور پیدا کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ لِذِكْرِيْ کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ تو مجھے نماز میں ذکر کرے یا مراد ہے کہ میں اس نماز کی وجہ سے علیین میں مدح کے ساتھ تیرا ذکر کروں۔ اس بنا پر مصدر فاعل یا مفعول کی طرف مضاف ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے توحید کے بعد نماز پر استقامت اختیار کر۔ یہ نماز کی قدر کی عظمت پر تنبیہ ہے کیونکہ نماز اللہ کی بارگاہ میں تضرع ہے اور اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس بنا پر نماز ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کو ذکر کا نام دیا ہے جب تو بھول جائے پھر تجھے یاد آئے تو نماز پڑھ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: فلیصلها اذا ذکرها تو نماز پڑھ جب تجھے یاد آئے یعنی بھولنے کی وجہ سے نماز کو ساقط نہ کر۔

مسئلہ نمبر 2۔ امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے نماز یاد آئے تو اسے ادا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ" ابو محمد عبد الغنی بن سعید نے حجاج بن حجاج کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ پہلا حجاج وہ ہے جس سے یزید بن زریع نے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں قتادہ نے بتایا انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے

پوچھا گیا جو نماز کے وقت میں سویا رہا اور اس سے غافل ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس نماز کو ادا کرے جب اسے یاد آئے'' (1)۔ ابراہیم بن طہمان نے حجاج سے روایت کرنے میں اس کی متابعت کی ہے، اسی طرح ہمام بن یحییٰ نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا فرمایا: جو نماز بھول جائے تو اس کا وقت وہ ہے جب اسے یاد آئے'' (2)۔ پس فلیصلھا اذا ذکرھا کا قول دلیل ہے کہ سو جانے والے اور غافل پر قضا واجب ہے خواہ نمازیں (جو قضاء ہوئیں) زیادہ ہوں یا کم ہوں۔ یہ عام علماء کا مذہب ہے اور ایک شاذ قول غیر معتد بہ اس کے مخالف بھی حکایت کیا گیا ہے کیونکہ یہ حدیث کی نص کے مخالف ہے وہ یہ ہے کہ بعض علماء سے مروی ہے کہ پانچ نمازوں سے زائد ہو جائیں تو قضاء لازم نہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور اوقات معینہ پر نص موجود ہے فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل: 78) اس کے علاوہ بھی نصوص موجود ہیں اور جس نے دن کی نماز کو رات کے وقت ادا کیا یا رات کی نماز کو دن کے وقت ادا کیا تو اس کا فعل اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہ ہو گا اور نہ اسے اس فعل پر ثواب ملے گا بلکہ وہ گنہگار ہو گا۔ اس تعریف پر جو نماز فوت ہو جائے اس کی قضا واجب نہیں اگر نبی پاک ﷺ کا یہ ارشاد نہ ہوتا: من نام عن صلاۃ أو نسیھا فلیصلھا اذا ذکرھا تو کوئی شخص اپنی اس نماز سے نفع حاصل کرنے والا نہ ہوتا جو غیر وقت میں ادا کی جاتی اس اعتبار سے وہ قضا ہو گی ادا نہ ہو گی کیونکہ قضا نئے حکم کے ساتھ ہے نہ کہ پہلے امر کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 3۔ جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کر دیا اس کے متعلق جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ اس پر قضا کرنا واجب ہے اگرچہ وہ گنہگار ہو گا مگر داؤد کا قول اس کے مخالف ہے۔ ابو عبد الرحمن اشعری شافعی نے داؤد کی موافقت کی ہے اس سے یہ قول ابن القصار نے حکایت کیا ہے اور جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والے، بھولنے والے اور سونے والے کے درمیان فرق گناہ کا نہ ہونا ہے جان بوجھ کر ترک کرنے والا گنہگار ہو گا لیکن تمام قضا کریں گے۔ اور جمہور علماء کے قول کی حجت یہ ارشاد ہے: وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (البقرہ: 43) اس میں کوئی تفریق نہیں وہ وقت میں ہو یا وقت کے بعد ہو یہ امر کا صیغہ ہے جو وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس طرح سونے والے اور بھولنے والے کی قضا کا امر ثابت ہے لیکن وہ گنہگار ہو گا پس جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کے لیے نماز کا قضا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من نام عن صلاۃ أو نسیھا اس میں نسیان بمعنی ترک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ: 67) نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ (الحشر: 19) خواہ یہ نسیان ذہول سے ہو یا بغیر ذہول کے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بھولنے سے پاک ہے اس لیے اس کا معنی ہے اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (البقرہ: 106) اس آیت میں بھی ننسھا کا معنی نترکھا ہے اسی طرح ذکر نسیان اور اس کے علاوہ صورت کے بعد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی، جس نے مجھے اپنے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، قضاء الفائتۃ، جلد 1 صفحہ 241۔ ابن ماجہ، باب من نام عن الصلاۃ او نسیھا، حدیث نمبر 686، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الصلوٰۃ، وقت الصلوٰۃ المنسیۃ، جلد 1 صفحہ 423

دل میں یاد کیا میں نے اسے یاد کیا۔ اللہ تعالیٰ نسیان سے پاک ہے اس لیے اس کا یاد کرنا نسیان کے بعد نہیں ہوتا اس کا معنی ہے علمت، پس اذا ذکرھا کا معنی ہوگا جب وہ اسے جان لے۔ نیز انسان کا وہ قرض جو وقت کے متعلق ہوتا ہے پھر وہ وقت آ جاتا ہے تو اس کے وجوب کے بعد اس کی قضا ساقط نہیں ہوتی (جب وہ ادا نہ کرلے) اور ابرا (بری کرنا) ہی ان کو ساقط کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے قرض میں بھی یہی ہوگا کہ ان میں ابرا صحیح نہیں ہوگا اور ان کی قضا ساقط نہ ہوگی مگر اس کے اذن سے۔ نیز جہاں تک ہمارا تعلق ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کا ایک روزہ ترک کردے اور جان بوجھ کر بغیر عذر کے ترک کردے تو اس کی قضا واجب ہے، اسی طرح نماز کی قضا بھی واجب ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام مالک سے مروی ہے: جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کبھی اسے قضا نہیں کر سکے گا۔ یہ اشارہ ہے کہ گذشتہ نماز کا اعادہ نہیں کر سکے گا یا یہ بطور سختی کلام فرمائی ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس نے جان بوجھ کر رمضان کا روزہ افطار کیا پوری زندگی کے روزے بھی اس کا کفارہ نہ ہوں گے اگرچہ وہ روزہ رکھ بھی لے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادا کے قائم مقام قضا کے ذریعے حکم کو پورا کرنا اور توبہ بھی کرنا ضروری ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہے گا کرے گا۔ ابوالمطوس نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ”جس نے ایک دن رمضان کا روزہ جان بوجھ کر ترک کیا پوری زندگی کے روزے اس کو پورا نہیں کریں گے، اگرچہ وہ اسے رکھ بھی لے“(1)۔ یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ اس کا معنی تغلیظ ہو (اگر یہ حدیث صحیح ہو) یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابوداؤد نے اس کو تخریج کیا ہے۔ احادیث صحیح میں کفارہ کا ذکر موجود ہے اور بعض میں اس دن کی قضا کا ذکر ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: من نام عن صلاۃ أو نسیھا (2)، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستیقظ (3) کے عموم کی تخصیص کرتا ہے اور یہاں رفع سے مراد گناہ کا اٹھنا ہے نہ کہ فرض کا اٹھنا یہ اس قول سے نہیں ہے۔ عن الصبی حتی یحتلم بچے مکلف نہیں ہے حتی کہ بالغ ہو جائے۔ اگرچہ یہ دونوں حکم ایک حدیث میں آئے ہیں پس اس اصل پر آگاہی حاصل کر۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس معنی میں علماء کا اختلاف ہے جسے فوت شدہ نماز یاد آئے جبکہ وہ نماز کے آخری وقت میں ہو یا وہ نماز میں ہو۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جسے نماز یاد آئے جبکہ دوسری نماز کا وقت ہو چکا ہو تو پہلے وہ نماز پڑھے جو وہ بھول گیا تھا۔ قضا شدہ نمازیں پانچ ہوں یا اس سے کم ہوں اگرچہ اس نماز کا وقت فوت بھی ہو جائے اور اگر پانچ نمازوں سے زیادہ ہوں تو پہلے وقتی نماز کو پڑھے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری اور لیث کا مذہب بھی یہی ہے مگر امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں: ہمارے نزدیک ایک دن اور ایک رات کی نمازوں میں ترتیب واجب ہے جب فوت شدہ نماز اور وقتی نماز کے لیے وقت میں

1۔ ترمذی، باب ما جاء فی الافطار متعمدا، حدیث نمبر 655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، الحث علی ذکر اللہ تعالیٰ، جلد 2، صفحہ 341

3۔ ابوداؤد، باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا، حدیث نمبر 3822، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وسعت ہو اور اگر وقتی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے وقتی نماز ادا کرے اور اگر پانچ نمازوں سے زیادہ نمازیں قضا ہو جائیں تو ان کے نزدیک ترتیب واجب نہیں ہوتی۔ ثوری سے ترتیب کا وجوب مروی ہے انہوں نے قلیل اور کثیر میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یہ امام شافعی کے مذہب کا حاصل ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: فوت شدہ کو پہلے پڑھے جب تک وقتی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو اگر وہ ایسا نہ کرے اور وقتی نماز پہلے پڑھ لے تو بھی انہوں نے جائز قرار دیا ہے۔ اثرم نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک ساٹھ سال کی نمازوں اور اس سے زائد نمازوں میں بھی ترتیب واجب ہے انہوں نے فرمایا: کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ نماز پڑھے جبکہ اسے اس سے پہلے والی فوت شدہ نماز یاد ہو کیونکہ یہ نماز اس پر فاسد ہوگی۔ دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنی فوت شدہ نماز کو یاد کرلے جبکہ وہ نماز میں ہو تو اس سے آغاز کرے جس میں وہ مشغول تھا جب اس سے فارغ ہو جائے تو وہ نماز پڑھے جو بھول گیا تھا''۔ اس کی سند میں عمر بن ابی عمر مجہول ہے۔ میں کہتا ہوں: اگر یہ صحیح ہوتی تو امام شافعی کے قول کے لیے حجت ہوتی کہ وقتی نماز کو پہلے پڑھے۔ صحیح وہ ہے جو اہل صحیح نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنگ خندق کے دن کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! اللہ کی قسم! میں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی حتی کہ سورج غرب ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے بھی نماز عصر نہیں پڑھی ہے''۔ پھر ہم بطحان کے مقام پر اُترے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضو فرمایا اور ہم نے بھی وضو کیا۔ پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سورج کے غروب ہونے کے بعد عصر کی نماز پڑھی پھر مغرب کی نماز پڑھی۔ یہ نص ہے کہ پہلے فوت شدہ نماز پڑھے پھر وقتی نماز پڑھے، خصوصاً مغرب کی نماز اس کا وقت تنگ ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک مشہور مذہب میں اس کا وقت ممتد نہیں ہوتا۔ امام شافعی کے نزدیک بھی یہی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی نے ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ مشرکین نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خندق کے روز چار نمازوں سے مشغول کیا حتی کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا۔ حضرت بلال اٹھے اور آذان دی پھر اقامت کہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور عصر کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور مغرب کی نماز پڑھی پھر اقامت ہوئی اور عشاء کی نماز پڑھی (1)۔ اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ جس کی بہت سی نمازیں فوت ہو جائیں وہ اسی ترتیب سے قضا کرے جس طرح فوت ہوئی تھیں جب اسی ایک وقت میں یاد آجائیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے جب فوت شدہ نماز اس وقت یاد آجائے جبکہ وقتی نماز کا وقت تنگ ہو۔ علماء کے تین اقوال ہیں۔ (۱) پہلے فوت شدہ نماز ادا کرے اگرچہ وقتی نماز کا وقت نکل بھی جائے، یہ امام مالک، لیث اور زہری وغیرہم کا قول ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ (۲) پہلے وقتی نماز پڑھے یہ حسن، شافعی اور اصحاب الحدیث کے فقہاء، محاسبی، ابن وہب مالکی کا قول ہے۔ (۳) اسے اختیار ہے جو چاہے پہلے پڑھ لے؛ یہ اشہب کا قول ہے۔ پہلی وجہ نماز کی کثرت ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زیادہ نمازیں ہوں تو وقتی نماز کو پہلے پڑھے؛ یہ قاضی

1۔ ترمذی، کتاب الصلاۃ باب ما جاء فی الرجل تفوتہ الصلاۃ، حدیث نمبر 164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عیاض کا قول ہے۔ اور تھوڑی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک سے مروی ہے کہ وہ پانچ اور اس سے کم ہیں۔ بعض نے فرمایا: چار اور اس سے کم ہیں۔ یہ حضرت جابر کی حدیث کی وجہ سے ہے اور چھ کے کثیر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ رہا وہ شخص جس کو نماز یاد آجائے جبکہ وہ نماز میں ہو اگر وہ امام کے پیچھے ہو تو جو ترتیب کے وجوب کا قول کرتے ہیں اور جو وجوب ترتیب کا قول نہیں کرتے سب کے نزدیک یہ ہے کہ وہ امام کے ساتھ نماز جاری رکھے حتی کہ اپنی نماز مکمل کرلے۔ اس میں اصل وہ حدیث ہے جو امام مالک اور دارقطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے فرمایا: جو تم میں سے کوئی نماز بھول جائے اور اسے یاد نہ آئے مگر جب وہ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ امام کے ساتھ نماز پڑھے جب اس نماز سے فارغ ہو تو وہ نماز پڑھے جو وہ بھول چکا تھا پھر دوبارہ وہ نماز پڑھے جو اس نے امام کے ساتھ پڑھی تھی۔ دارقطنی کا لفظ ہے۔ موسیٰ بن ہارون نے کہا ہمیں ابو ابراہیم ترجمانی نے بیان کیا فرمایا ہمیں سعید نے یہ حدیث بیان کی اور انہوں نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا اور مرفوع روایت میں ان کا وہم ہے۔ اگر انہوں نے اس کے رفع سے رجوع کرلیا ہے تو اس نے صواب کی موافقت کی ہے۔ پھر علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل نے کہا: پہلے فوت شدہ نماز پڑھے پھر وہ نماز پڑھے جو امام کے ساتھ پڑھی مگر یہ کہ ان دونوں نمازوں کے درمیان پانچ نمازوں سے زیادہ ہوں جیسا کہ کوفیوں سے پہلے روایت کیا گیا ہے۔ یہ امام مالک کے مدنی اصحاب کا مذہب ہے۔ خرقی نے امام احمد بن حنبل سے روایت کیا ہے فرمایا: جسے فوت شدہ نماز یاد آئے جبکہ وہ دوسری نماز میں ہو تو وہ اسے مکمل کرلے اور پھر یاد آنے والی نماز قضا کرلے اور پھر اس کا اعادہ کرے جس میں پہلے تھا جبکہ وقت میں وسعت ہو اگر اسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو اور وہ نماز میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ اس کا اعادہ نہیں کرے گا تو اس کی وہ نماز جائز ہوجائے گی تو پھر وہ قضا نماز ادا کرے۔ امام مالک نے فرمایا: جس کو نماز یاد آئے جبکہ وہ نماز میں ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکا ہو تو دو رکعتوں پر سلام پھیر دے۔ اگر وہ امام ہو تو اس کی اور مقتدیوں کی نماز باطل ہو جائے گی؛ یہ امام مالک کا ظاہر مذہب ہے لیکن امام مالک کے اصحاب میں سے اہل نظر کا نظریہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ ان کا قول اس شخص کے بارے میں جسے نماز میں فوت شدہ نماز یاد آئی جبکہ وہ ایک رکعت پڑھ چکا تھا تو اس کے ساتھ دوسری رکعت ملالے اور سلام پھیر دے وہ نماز نفل ہوجائے گی فاسد نہ ہوگی۔ اگر وہ نماز ٹوٹ جاتی اور باطل ہوجاتی تو اسے دوسری رکعت ملانے کا حکم نہ دیا جاتا جیسا کہ اگر ایک رکعت میں حدث لاحق ہوجائے تو دوسری رکعت اس کے ساتھ نہیں ملائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ امام مسلم نے ابو قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا حدیث المیضاۃ طویل ذکر کی اس میں فرمایا: أما لکم فیّ اسوۃ، کیا تمہارے لیے میری ذات میں اسوہ نہیں ہے۔ پھر فرمایا: ''سونے کی صورت میں تفریط (کوتاہی) نہیں ہے کوتاہی تو اس پر ہے جس نے نماز نہ پڑھی حتی کہ دوسری نماز کا وقت آگیا جس نے ایسا کیا وہ نماز پڑھے جب بیدار ہو جب دوسرا دن ہوجائے تو اس کو اس کے وقت میں ادا کرے''۔ اس حدیث کو دارقطنی نے ذکر کیا ہے اسی طرح مسلم کے الفاظ کے برابر ہے۔ پس اس کا ظاہر دو مرتبہ اعادہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی یاد کے وقت اور آنے والے وقت میں اس کی مثل نماز کی ادائیگی کے وقت۔ اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ابوداؤد نے عمران بن حصین کی حدیث سے

نقل کی ہے اور انہوں نے واقعہ ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں ہے: ”تم میں سے جو دوسرے دن صبح کی نماز کو پائے تو وہ اس کے ساتھ اس کی مثل ادا کرے“ (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ اپنے ظاہر پر نہیں ہے ایک مرتبہ اعادہ کیا جائے گا کیونکہ دار قطنی نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ایک غزوہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جب سحری کا وقت تھا تو ہم نے پڑاؤ کیا ہم بیدار نہ ہوئے حتی کہ سورج کی دھوپ نے ہمیں بیدار کیا ہم میں ایک شخص گھبرا کر اٹھا جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو ہمیں وہاں سے چلنے کا حکم دیا پھر ہم چلتے رہے حتی کہ سورج بلند ہو گیا لوگوں نے قضاء حاجت کی پھر حضرت بلال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان دینے کا حکم دیا انہوں نے اذان دی پھر ہم نے دو رکعتیں ادا کیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو اقامت کہنے کا حکم دیا پھر ہم نے صبح کی نماز پڑھی ہم نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! کیا ہم کل ان دو رکعتوں کو ان کے وقت میں ادا نہیں کریں گے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ تمہیں ربا (سود) سے منع کرتا ہے اور تم سے وہ (سود) قبول کرے گا۔ خطابی نے کہا: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے وجوبی طور پر یہ کہا ہو مناسب یہی ہے کہ یہ امر استحباب کے لیے ہوتا کہ قضا میں وقت کی فضیلت کا خیال رکھا جائے۔ صحیح یہ ہے کہ اس پر عمل متروک ہے کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ تمہیں سود سے منع کرتا ہے تم سے وہ قبول کرے گا“ (2)۔ صحاح کے طرق جو عمران بن حصین کی حدیث کے ہیں ان میں اس زیادتی میں سے کچھ بھی نہیں ہے مگر جو ابو قتادہ کی حدیث سے ذکر کیا گیا ہے وہ محتمل ہے جیسا کہ ہم نے اس کو بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا طبری نے (احکام القرآن) میں ذکر کیا ہے کہ سلف میں سے ایسے بھی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: من نسی صلاۃ فلیصلھا إذا ذکرھا لا کفارۃ لھا إلا ذالك، کی مخالفت کی ہے انہوں نے کہا: اس کے وقت کی مثل تک صبر کرے پھر نماز پڑھے اور جب صبح کی نماز فوت ہو جائے تو اسے دوسرے دن صبح ادا کرے، یہ شاذ قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۝ یہ مشکل آیت ہے۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے اکاد اخفیھا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا: اس کا معنی ہے ظاہر کرنا۔ لِتُجْزٰى جزا کے لیے اظہار کرنا۔ اس کو ابو عبید نے کسائی سے روایت کیا ہے انہوں نے محمد بن سہل سے انہوں نے ورقاء بن ایاس سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: اس حدیث کا اس طریق کے علاوہ کوئی طریق نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں روایت کیا ہے: حدثنی ابی حدثنا محمد بن الجھم الفراء حدثنا الکسائی، حدثنا عبداللہ بن ناجیہ حدثنا یوسف حدثنا یحییٰ الحمانی حدثنا محمد بن سھل، نحاس نے کہا: اس سند سے عمدہ وہ ہے جو یحییٰ القطان نے ثوری سے انہوں نے سائب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اَكَادُ اُخْفِيْهَا ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن جبیر کی قرأت، اَخفیھا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ مذکورہ سند کے ساتھ ہے۔ ابو بکر انباری نے کہا: فراء نے

1۔ ابوداود، باب فی من نام عن الصلاۃ او نسیھا، حدیث نمبر 372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم السنن جلد 1، صفحہ 139

کہا اس کا معنی ہے اظهرها یہ خفیت الشیٔ أخفیه سے مشتق ہے جب تو اس کو ظاہر کردے۔ فراء نے بطور دلیل امرء القیس کا یہ شعر پڑھا ہے:

فإن تَدفِنُوا الدَّاءَ لاَنَخفِهِ وإنْ تَبْعَثُو الحرب لانَقْعُد

شاعر کی لانخفه سے مراد لانظهره (ہم ظاہر نہیں کریں گے) ہے بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اخفیها ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے اس کا معنی ہے اظهرها کیونکہ کہا جاتا ہے: خفیت الشی واخفیته جب اسے ظاہر کردے۔ فاخفیته اضداد کے حروف میں سے ہے پوشیدہ کرنا اور ظاہر کرنا دونوں معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: خفیت وأخفیت دونوں کا ایک معنی ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ ہے یہ ابوالخطاب سے اس نے روایت کیا ہے یہ اہل لغت کے رؤساء میں سے ایک تھا اس کے صدق میں شک نہیں کیا جاتا۔ سیبویہ نے اس سے روایت کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

وإن تَكْتُموا الداءَ لانُخْفِهِ وإنْ تَبْعَثوا الحربَ لانَقْعُد

اسی طرح ابوعبیدہ نے ابوالخطاب سے نون کے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

امرء القیس نے کہا:

خَفَاهنّ من أنفاقِهِنّ كأنّما خفاهن وَدْقٌ عن عَشِيٍّ مُجَلِّبِ

خفاهنّ کا معنی اظهرهن ہے۔ عشی مجلب کی جگہ من سحاب مرکب بھی مروی ہے۔ ابوبکر انباری نے کہا: ایک دوسری تفسیر بھی کی گئی ہے۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ أَكَادُ، اکاد پر کلام ختم ہوئی اور اس کے بعد کلام مضمر ہے أكاد أتي بها اور ابتدا أُخْفِيهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ سے ہے ضابی برجمی نے کہا:

هَمَمْتُ ولم أفعلْ وكِدتُ دليتَنِي تَركتُ على عثمانَ تَبكِي حَلاَئِلُهُ

اس سے مراد وكدت أفعل ہے كدت کے ساتھ فعل مضمر ہے جیسے قرآن میں اس کے ساتھ فعل مضمر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ نحاس نے اختیار کیا ہے اور اس سے پہلے قول کو صحیح نہیں سمجھا اس نے کہا: کہا جاتا ہے: خفی الشیٔ یخفیه جب وہ ظاہر کرے۔ اور اس نے یہ بھی حکایت کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أخفاه جب وہ کسی چیز کو ظاہر کرے اور یہ معروف نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو دیکھا جب اس پر اخفیها کا معنی بیان کرنا مشکل ہوا تو اس نے اس قول کی طرف عدول کیا اور کہا: اس کا معنی وأخفیها کے معنی کی طرح ہے۔ نحاس نے کہا: یہ اظهرها کے معنی پر نہیں ہے، خصوصاً اخفیها شاذ قرأت ہے پس قرأت صحیحہ کو شاذ قرأت کی طرف کیسے پھیرا جاتا ہے؟ مضمر کے معانی اولیٰ ہیں۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی: ان الساعة آتیه اكاد آتی بها، آتیه پر آتی بها دلالت کرتا ہے پھر فرمایا: اخفیها سے نئی کلام ہے۔ یہ معنی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کو مخفی رکھا اور الساعة جس میں انسان مرتا ہے اس کو بھی مخفی رکھا تا کہ انسان اچھے اعمال کرتا رہے اس سے اس معاملہ کو مخفی رکھا تا کہ وہ توبہ کو مؤخر نہ کرے۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر لتجزی میں جو لام ہے وہ أخفیها کے متعلق ہوگا۔ ابوعلی نے کہا: یہ سلب کے باب سے

ہے۔ اضداد کے باب سے نہیں ہے۔ اخفیھا کا معنی ہے اس سے خفا کو زائل کیا اور وہ اس کا ڈھانپنا ہے، جیسے خفاء الأخفیه اس سے مراد چادریں ہیں اور اس کا واحد خِفاء خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جس کو اوپر لپیٹا جائے۔ (چادر) اور جب اس سے پردہ زائل کر دیا تو وہ ظاہر ہو گئی یہ عربوں کے اس قول سے ہے: أشکیته میں نے اس کی تکلیف دور کی۔ أعدیته میں نے اس کی جانب سے مدد طلب کرنے کو قبول کیا اور اسے اس کے اعادہ کا موقع نہ دیا۔ ابو حاتم نے اخفش سے حکایت کیا ہے کہ کاد زائدہ مؤکدہ ہے۔ اور فرمایا: اس کی مثال اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا (النور: 40) ہے، کیونکہ وہ ظلمات جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے ان میں سے بعض ناظر اور منظور الیہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں؛ یہ معنی ابن جبیر سے مروی ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: إن الساعة آتیه أخفیها کل نفس بما تسعیٰ، شاعر نے کہا:

سریعٌ إلی الهیجاءِ شاكٍ سِلاحُهٗ　فما إنْ یَكادُ قِرْنُهٗ یَتَنَفَّسُ

شاعر نے فما یتنفّس کا معنی مراد لیا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

وألاّ ألوم النفسَ فیما أصابنی　وألّا أكاد بالذی نِلتُ أنْجَحُ

اس کا معنی ہے ألا أنجح بالذی نلته، پس أکاد کلام کی تو کید کے لیے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: أكاد أخفیها کا معنی ہے میں اس کو قریب کروں گا، کیونکہ جب تو کہتا ہے: کاد زیدٌ یقوم یہ دونوں صورتوں میں جائز ہے، خواہ زید کھڑا ہو یا کھڑا نہ ہو۔ اس پر دلیل یہ ہے اس نے اس کو مخفی کیا اس جواب پر اس کے علاوہ کی دلالت کی وجہ سے۔ لغوی علماء نے کہا: کدت أفعل کا معنی عربوں کے نزدیک یہ ہے کہ میں فعل کے قریب تھا اور میں نے وہ فعل کیا نہیں اور ما کدت افعل کا معنی ہے میں نے تاخیر کے بعد وہ کام کیا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ (البقرہ) اس کا مطلب ہے انہوں نے تاخیر کے بعد یہ کام کیا کیونکہ ان پر گائے کا پانا مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی ما کدت أفعل کا معنی ہوتا ہے مافعلت ولا قاربت جب کلام کو أکاد کے ساتھ موکد کیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: أكاد أخفیها کا معنی ہے میں اس کو چھپانا چاہتا ہوں۔ انباری نے کہا: اس کی دلیل یہ شعر ہے:

كادتْ وكِدتُ وتِلكَ خیرُ إرادةٍ　لوعَادَ من لَهْوِ الصَّبابة مامَضَیٰ

اس کا معنی ہے أرادت وأردت، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین نے کہا جیسا کہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی ہے اکاد اخفیها من نفسی اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں تھا اور حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح تھا: أکاد اخفیها من نفسی فکیف یعلمها مخلوق۔ اور بعض قراٰتوں میں ہے فکیف أظهرها لکم یہ اس پر محمول ہے جو عربوں کی عادت ہے کہ جب کوئی کسی چیز کو چھپانے میں مبالغہ کرے تو کہتا ہے: کدت أخفیه من نفسی اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے؛ یہ معنی قطرب وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ شاعر نے کہا:

أیامَ تَصحبنی هند وأخبرُها　ما أكتم النفسَ من حَاجِی وأسْرارِی

پس وہ کیسے اسے اس کی خبر دیتا ہے جو اس نے اپنے نفس سے چھپایا ہوا ہے۔

اسی باب سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: رجل تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فأخفاها حتی لا تعلم شماله ماتنفق یمینه، وہ

شخص جو صدقہ کرے اور اتنا خفیہ طریقہ سے کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو جو اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہے۔
بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے أكاد أخفيها من نفسي،(1) اس محذوف پر کلام میں کوئی دلیل نہیں ہے اور ایسا محذوف جس پر دلیل نہ ہو وہ مطروح ہے اور جنہوں نے یہ معنی بیان کیا ہے انہوں نے حضرت ابی بن کعب کے مصحف کی عبارت کی وجہ سے یہ کہا اس میں ہے أكاد أخفيها من نفسي اور بعض مصاحف میں ہے أكاد أخفيها من نفسي فكيف أظهركم عليها۔
میں کہتا ہوں بعض علماء نے کہا: جنہوں نے أكاد أخفيها من نفسي کہا ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اخفا میری طرف سے تھا کسی غیر کی طرف سے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے أكاد اخفيها من نفسي اور طلحہ بن عمرو نے عطا سے یہ روایت کیا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کیا ہے فرمایا: میں اس پر کسی کو ظاہر نہیں کروں گا۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے فرمایا: قد أخفاها یہ اس بنا پر ہے کہ کاد زائدہ ہے یعنی قیامت آنے والی ہے جس کو میں نے پوشیدہ رکھا ہے اور پوشیدہ رکھنے کا فائدہ تخویف (ڈرانا) اور تہویل (ہولناک بیان کرنا) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لِتُجْزٰی کا تعلق وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ سے ہے۔ پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے؛ یعنی أقم الصلاة لتذكرني۔
لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی۝ یعنی بسعيها اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا، والله اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: لتجزی، آتية کے متعلق ہے یعنی ان الساعة آتية لتجزی، فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا یعنی اس پر ایمان لانے سے اور اس کی تصدیق کرنے سے تجھے نہ پھیرے۔ مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی، فتردی کا معنی فتهلك ہے یہ نہی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰی۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی۝

”اور (ندا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ! عرض کی: (میرے رب) یہ میرا عصا ہے، میں ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لیے اور میرے لیے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں“۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ، بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کیا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰی۝ (غور سے سنو جو وحی کیا گیا ہے) اور نبی کی ذات میں ایک معجزہ کا ہونا ضروری ہے جس کے ساتھ وہ اپنی نبوت کی صحت کو جان لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا میں اور اپنی ذات میں معجزہ کی صورت دکھائی۔ یہ بھی جائز ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے درخت میں معجزہ دکھایا تھا وہ ان کی ذات کے لیے کافی ہو پھر ہاتھ اور عصا زیادہ تاکید کے لیے ہوں اور بطور دلیل اپنی قوم کو یہ پیش کیے ہوں۔ مَا تِلْكَ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 9665

میں جو ما ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ زجاج اور فراء نے کہا: یہ اسم ناقص ہے بیمینک کے ساتھ ملایا گیا ہے، یعنی ما التی بیمینت؛ فراء نے یہی کہا ہے سوال کا مقصود امر کا ثبوت ہے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہیں یہ میرا عصا ہے تاکہ حجت اعتراف کے بعد ان پر ثابت ہو جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ازل سے جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ابن جوہری نے کہا: بعض آثار میں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عتاب فرمایا کہ انہوں نے عصا کی نسبت اپنی طرف کر دی تو انہیں کہا گیا اپنا عصا ڈالو تاکہ اس سے تم تعجب دیکھ لو اور تم جان لو کہ تمہاری اس پر ملکیت نہیں ہے اور تمہاری طرف منسوب نہیں ہے۔ ابن ابی اسحاق نے عصیّ پڑھا ہے۔ یہ لغت ہذیل کی بنا پر ہے اس کی مثل یابشریٰ اور محیَّ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ حسن نے عصای التقاء ساکنین کی وجہ سے یا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل حمزہ کی قرأت ہے۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ (ابراہیم: 22) ابن ابی اسحاق نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ایک سوال کے بہت سے جواب دیے جا سکتے ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا: وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۝ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چار چیزیں ذکر کیں۔ عصا کی نسبت اپنی طرف کی، حق تو یہ تھا کہ صرف عصا کہتے۔ التوکو (سہارا لینا) الھش (پتے جھاڑنا) اور مآرب اخریٰ (دوسرے فائدے) کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کے بڑے بڑے اور عمدہ فوائد کا ذکر فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے بارے پوچھا گیا فرمایا: ''اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے''(1)۔ ایک عورت نے چھوٹے بچے کے متعلق پوچھا جب وہ آپ کے پاس لے آئی تھی اس نے پوچھا (حضور!) کیا اس پر حج ہے؟ فرمایا ''ہاں اور تیرے لیے اجر ہے''۔ اس کی مثالیں حدیث میں کثرت سے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا یعنی چلنے اور ٹھہرنے میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں۔ اسی سے الاتکاء ہے۔ وَاَهُشُّ بِهَا اور اَهِشّ بھی ہے؛ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے؛ یہ نخعی کی قرأت ہے یعنی میں اس کے ساتھ پتے جھاڑتا ہوں یعنی درختوں کی ٹہنیوں کو مارتا ہوں تاکہ اس کے پتے گریں تاکہ میری بکریوں پر ان کا کھانا آسان ہو جائے۔ راجز نے کہا:

أَهُشُّ بالعَصَا على أَغْنَامِي من ناعِمِ الأَرَاكِ والبَشَامِ

کہا جاتا ہے: هَشّ علی غنمه يَهُشّ۔ هاء کے ضمہ کے ساتھ۔ هَشّ الی الرجل يَهَشّ، هاء کے فتحہ کے ساتھ۔ اسی طرح هَشّ يَهَشّ وهَشِشتُ انا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: هَشِشْتُ يوماً فقبلت وأنا صائم (2)۔ شمر نے کہا: اس کا معنی ہے میں خوش ہوا اور شوق پورا کیا۔ فرمایا: هاش بمعنی هش بھی جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

فكبّر للرؤيا وهَاشَ فؤادُهُ وبشّر نفساً كان قبل يلومها

یعنی اس کا دل خوش ہوا۔ هش کا لغوی معنی رخاوة ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل هش وزوج هش۔ عکرمہ نے اسے أهُسُّ پڑھا ہے، یعنی سین کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان دونوں لغتوں کا ایک معنی ہے۔ بعض نے فرمایا: ان دونوں کا

1۔ موطا امام مالک، الطهور للوضوء کتاب الطهارة
2۔ ابوداؤد، باب القبلة لصائم، حدیث نمبر 2037

معنی مختلف ہے۔ الھش کا معنی درختوں کے پتے جھاڑنا ہے اور الھس کا معنی بکریوں کو جھڑکنا ہے، یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ عکرمہ سے أھس یعنی سین کے ساتھ مروی ہے، یعنی میں اس کے ساتھ بکریوں کو زجر کرتا ہوں۔ الھس کا معنی بکریوں کو جھڑکنا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ۞، مَآرِبُ سے مراد ضروریات ہیں۔ اس کا واحد مأربة اور مأرَبة اور مأرِبة ہے۔ اور اخریٰ واحد کا صیغہ ذکر فرمایا کیونکہ مآرب جماعت کے معنی میں ہے، لیکن توابع میں واضح طریقہ یہ ہے کہ غیر ذوی العقول کی جمع مفرد ہو اور اس کے لیے بھی کنایہ ہو کیونکہ وہ واحد مونث کے قائم مقام ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف: 180) اور ارشاد ہے: يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ (سبا: 10) یہ سورہ اعراف میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ایک قوم نے عصا کے منافع کو شمار کیا ہے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں فرمایا: جب میں کنویں پر پہنچتا ہوں اور اس کی رسی چھوٹی ہوتی ہے تو اس کو عصا کے ساتھ باندھ دیتا ہوں جب مجھے سورج کی گرمی لگتی ہے تو اسے زمین میں گاڑ دیتا ہوں اور اس پر کوئی چیز ڈال دیتا ہوں جو مجھ پر سایہ کرتی ہے۔ جب مجھے زمین کے کیڑے مکوڑوں کا خوف ہوتا ہے تو میں انہیں عصا کے ساتھ مار دیتا ہوں اور جب چلتا ہوں تو اسے کندھے پر رکھ لیتا ہوں اور اس پر اپنی کمان، ترکش اور جھولا لٹکا دیتا ہوں اور اس کے ذریعے بکریوں سے درندوں کو دور کرتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے میمون بن مہران نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عصا رکھنا انبیاء کی سنت ہے اور مومن کی علامت ہے۔ حسن بصری نے کہا اس میں چھ خصائل ہیں۔ (۱) انبیاء کی سنت ہے۔ صلحاء کی زینت ہے۔ دشمنوں کی خاطر یہ ہتھیار ہے۔ کمزوروں کے لیے مدد کا باعث ہے۔ منافقین کے لیے غم کا باعث ہے اور طاعات میں زیادتی کا باعث ہے۔ کہا جاتا ہے: جب مومن کے ساتھ عصا ہوتا ہے تو اس سے شیطان بھاگتا ہے اور اس سے منافق اور فاجر ڈرتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اس کے قبلہ (کی طرف سترہ) ہوتا ہے اور جب مومن کمزور ہوتا ہے تو یہ اس کے لیے قوت کا سبب ہوتا ہے۔ حجاج ایک اعرابی کو ملا اور پوچھا: تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا: میرا عصا ہے، اسے میں نماز کے لیے زمین میں گاڑھتا ہوں، میں اسے اپنے دشمنوں کے لیے تیار رکھتا ہوں، اس کے ساتھ اپنے جانور ہانکتا ہوں، سفر میں اس کے ساتھ قوت حاصل کرتا ہوں، چلتے وقت اس پر سہارا لیتا ہوں تاکہ لمبے قدموں سے چلوں اور اس کے ساتھ نہر عبور کرتا ہوں، یہ مجھے ٹھوکر لگنے سے محفوظ رکھتا ہے، اس پر کپڑے ڈالتا ہوں جو مجھے گرمی سے بچاتا ہے اور ٹھنڈک سے بچاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس چیز کو قریب کرتا ہوں جو مجھ سے دور ہوتی ہے۔ یہ میرے دستر خوان کا محمل ہے اور میرے دوسرے سامان کو لٹکانے کا ذریعہ ہے۔ لڑائی کے وقت اس کے ساتھ لڑائی کرتا ہوں، اس کے ساتھ دروازوں کو کھٹکھٹاتا ہوں، اس کے ساتھ کتوں کے کاٹنے سے بچتا ہوں، ہم عصروں کے مقابلہ کے لیے تیر اور تلوار کا کام دیتا ہے، یہ میرے باپ کا ورثہ ہے اور یہ میں اپنے بیٹے کو ورثہ میں دوں گا، اس کے ساتھ اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی لاتعداد منافع ہیں۔

میں کہتا ہوں: عصا کے منافع کثیر ہیں۔ بعض مقامات میں شرعی اعتبار سے اس کا دخل ہوتا ہے مثلاً صحراء میں قبلہ بنایا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھونٹی تھی جس کو گاڑھا جاتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ جب عید کے دن آپ نکلتے تھے تو کھونٹی گاڑھنے کا حکم دیتے تھے وہ آپ کے سامنے گاڑھی جاتی تھی اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ صحیح میں ثابت ہے۔ الحربة، العنزة، النيزك، والآلة یہ تمام ایک مسمی کھونٹی کے نام ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک کھونٹی تھی جس کے ساتھ آپ حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے تھے جب اس کو بوسہ دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ یہ بھی صحیح میں ثابت ہے۔ موطا میں سائب بن یزید سے مروی ہے فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعتیں پڑھائیں قاری سو سو آیات والی سورتیں پڑھتا تھا حتی کہ ہم قیام کے لمبا ہونے کی وجہ سے اپنے عصا پر سہارا لیتے تھے اور ہم مسجد سے صبح کے طلوع ہونے سے کچھ پہلے واپس گھر آتے تھے۔ صحیحین میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھونٹی تھی، اس پر اجماع ہے کہ خطیب تلوار یا عصا پر سہارا لے کر خطبہ دے۔ عصا کا ثبوت اصل کریم اور معدن شریف سے ہے۔ اس کا انکار صرف جاہل ہی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عصا میں بہت سے معجزات جمع فرمائے تھے۔ اس کی وجہ سے معاندین جادوگر بھی آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خطبہ دینے، وعظ و نصیحت کرنے اور نماز کی طوالت کے لیے عصا بنایا تھا۔ حضرت ابن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عصا اور کھونٹی بردار تھے اور وہ چھڑی پکڑ کر خطبہ دیتے تھے۔ بس عصا کے شرف پر یہ فضیلت کافی ہے۔ خلفاء، کبراء، خطباء کا عمل اسی پر ہے۔ فصحاء عرب کی عادت بھی عصا اور کھونٹی پکڑنا اور کلام کرتے وقت اس پر سہارا لینا ہے۔ محافل اور خطبوں میں بھی وہ اس پہ سہارا لیتے تھے۔ شعوبیہ فرقہ خطباء عرب پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ کھونٹی پکڑتے ہیں اور اس کے ساتھ معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شعوبیہ فرقہ عربوں سے بغض کرتا ہے اور عجمیوں کو فضیلت دیتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: عطاء بن سائب کھونٹی ہاتھ میں پکڑتے تھے اور اس سے مدد حاصل کرتے تھے۔ امام مالک نے فرمایا: آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ جوانی کی مثل نہیں ہوتا۔ آدمی اٹھتے وقت اس سے قوت حاصل کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کے بارے میں ایک شاعر نے کہا:

قد كنتُ أمشي على رجلين معتمدًا　　فصرتُ أمشي على أخرى من الخَشَبِ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لوگ عصا لے کر نکلتے ہیں جب بارش آتی ہے اور ان پر سہارا لیتے ہیں حتی کہ نوجوان بھی اپنے اپنے عصا لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اپنے ہم مجلسوں میں عصا لیتے تھے تا کہ اس کے سہارے کھڑے ہوں۔ عصا کے منافع میں سے یہ بھی ہے کہ اصلاح کی خاطر آدمی اپنی بیویوں کو مارتا ہے اس کے ساتھ اپنی اور اپنے گھر والوں کی اصلاح کرتا ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ابوجہم وہ تو اپنے کندھے سے عصا رکھتا ہی نہیں ہے''۔ ایک روایت میں ہے ایک شخص کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے اہل سے لاٹھی نہ اٹھا اللہ کی ذات کے بارے میں انہیں ڈرا'' (1)۔ حضرت عبادہ بن

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 22075

صامت سے امام نسائی نے اس کو روایت کیا ہے۔ اس مفہوم سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے ''تو اپنے عصا کو وہاں لٹکا جہاں سے تیرے گھر والے اسے دیکھ سکیں'' (1)۔ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اس کے فوائد میں سے ہے کہ اس دنیا سے منتقل ہونے پر تنبیہ ہے جیسا کہ کسی زاہد شخص سے کہا گیا: تجھے کیا ہے کہ تو عصا پر چلتا ہے جبکہ تو نہ بوڑھا ہے اور نہ مریض ہے؟ اس نے کہا: میں جانتا ہوں میں مسافر ہوں یہ دنیا فانی ہے اور عصا سفر کا آلہ ہے۔ بعض شعراء نے کہا:

حملتُ العصا لا الضّعف أوجب حملَها علىّ ولا أنّى تحنّيتُ من كِبَرْ

ولكنّى ألزمتُ نفسى حَمْلَها لأُعلِمها أنّ المقيمَ على سَفَرْ

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَ اضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾

''حکم ہوا: ڈال دے اسے زمین پر اے موسیٰ۔ تو آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا پس اچانک وہ سانپ بن کر (ادھر اُدھر) دوڑنے لگا۔ حکم ہوا: اسے پکڑ لو اور مت ڈرو ہم لوٹا دیں گے اسے اپنی حالت پر۔ اور (حکم ملا) دبا لو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے یہ نکلے گا جب سپید ہو کر بغیر کسی بیماری کے یہ دوسرا معجزہ (ہم نے تمہیں دیا) ہے، تا کہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے حصول اور اس کی تکلیف برداشت کرنے کی تدریب کر لیں تو عصا ڈالنے کا حکم دیا۔ فَاَلْقٰىهَا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوصاف اور اعراض تبدیل کر ڈالے وہ عصا دو شاخوں والا ہے تو اس کی وہ دو شاخیں اس کا منہ بن گئیں اور وہ سانپ بن گیا جو دوڑ رہا تھا اور پتھروں کو نگل رہا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے دیکھا تو تعجب سے دیکھا اور وَلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ (النمل: 10) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اسے پکڑ لو اور مت ڈرو۔ یہ اس لیے فرمایا کیونکہ انہوں نے اپنے دل میں بتقاضائے بشریت خوف محسوس کیا۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے جبے کی آستین کے ساتھ پکڑا تو انہیں اس طرح پکڑنے سے منع کیا گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے ہاتھ سے پکڑا تو وہ عصا بن گیا جس طرح کہ پہلے تھا۔ یہ اس کی پہلی حالت تھی۔ اس نشانی کو ان کے لیے اس لیے ظاہر فرمایا تا کہ آپ اس سے خوفزدہ نہ ہوں جب اسے آپ فرعون کے پاس زمین پر ڈالیں۔ کہا جاتا ہے کہ عصا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چلتا تھا اور باتیں کرتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر سامان لٹکاتے تھے اور رات کے وقت اس کی شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتی تھی اور جب آپ پانی نکالنا چاہتے تھے تو وہ شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتی تھیں اور جب آپ کو پھل کھانے کا شوق ہوتا تو اسے زمین پر گاڑھ دیتے تھے اور اس پر پھل لگ جاتا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ ڈنڈا جنت کے آس

1۔ مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر 17963

کے درخت کا تھا۔ بعض نے فرمایا: اسے جبریل لے کر آئے تھے۔ بعض نے فرمایا: کوئی اور فرشتہ لے کر آیا تھا۔ بعض نے فرمایا: حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا اس گھر سے ایک چھڑی لے لو تو وہ چھڑی آپ کے ہاتھ میں عصا بن گئی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا عصا جنت سے آپ کے ساتھ اُترا تھا؛ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰى ۝ نحاس نے کہا: حیۃ بھی جائز ہے۔ کہا جاتا ہے: خرجت فاذا زید جالس و جالساً۔ حیہ پر وقف ھا کے ساتھ ہے۔ السعی کا معنی جلدی اور پھرتی سے چلنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ عصا بڑا سانپ بن گیا تھا وہ پتھروں اور درختوں کو نگل لیتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو ہر چیز کو نگل رہا ہے تو وہ اس سے خوفزدہ ہوئے اور اس سے دور ہوئے۔ بعض سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے اس لیے خوفزدہ ہوئے کیونکہ آپ کو معلوم تھا جو اس ڈنڈے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے برداشت کیا تھا۔ بعض نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تَخَفْ (ڈرو نہیں) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف ختم ہو گیا اور دل مطمئن ہو گیا۔ آپ نے اس کے منہ میں اپنا ہاتھ داخل کیا اور اس کے جبڑوں سے پکڑ لیا۔ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰى میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے سنا ہے۔ تقدیر عبارت الی سیرتہا ہے جیسے اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ (الاعراف:155) (میں حرف جر کو حذف کیا گیا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ، غیر قرآن میں ضُمّ میم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ جائز ہے، کیونکہ التقائے ساکنین پایا گیا ہے۔ اور فتحہ عمدہ ہے کیونکہ وہ خفیف ہے اور کسرہ اصل کی بنا پر ہے اور ضمہ اتباع کی بنا ہے۔ یدٌ اصل میں یدیٌ فعل کے وزن پر ہے اس پر دلیل جمع ایدٍ ہے اور تصغیر یُدَیّۃ ہے۔ الجناح سے مراد بازو ہے؛ مجاہد نے یہ کہا ہے اور فرمایا: الی بمعنی تحت ہے۔ قطرب نے کہا: جناحک سے مراد الی جیبک ہے۔ اسی سے زاجز کا قول ہے:

أضمُّهُ للصدر والجَناح

بعض نے فرمایا: الی جنبک کو الی جناحک سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ وہ جناح کے محل میں مائل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب الی عندک ہے۔ مقاتل نے کہا: الی بمعنی مع ہے یعنی مع جناحک، تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ یعنی بغیر برص کے چھانے والے نور کے ساتھ نکلے گا، دن اور رات کو سورج اور چاند کی طرح چمکے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یعنی وہ اس طرح چمکدار تھا کہ آپ کی رنگت کے مخالف تھا۔ بَیْضَآءَ حال کی بنا پر منصوب ہے اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں دو الف تانیث ہیں، یہ اس سے زائل نہیں ہوتے گویا ان دونوں کا لزوم دوسری علت ہے نکرہ میں غیر منصرف ہے۔ یہ دونوں الف ھاء کے مخالف ہیں کیونکہ ھا اسم سے جدا ہوتی ہے۔ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ، مِنْ، بیضا کے متعلق ہے جیسے تو کہتا ہے: أبیضت من غیر سوئٍ، اٰیَةً اُخْرٰى، یعنی عصا کے معجزہ کے علاوہ یہ معجزہ ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کرتہ جبہ سے اپنا ہاتھ نکالا تو اس کی سورج کی شعاع کی طرح روشنی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اور آیۃ، بیضاء سے بدل کی بنا پر منصوب ہے؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول حسن ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے تجھے دوسرا معجزہ دیا یا دوسرا معجزہ دیں گے کیونکہ فرمایا: تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ یہ دلیل ہے کہ آپ کے پاس دوسرا معجزہ آیا۔ لِنُرِیَكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰى، کبریٰ سے

مراد بڑا ہے۔ حق یہ تھا کہ الکبیرہ ہوتا لیکن الکبریٰ فرمایا تا کہ آیات کے قافیے مل جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اضمار ہے اس کا معنی ہے، لنریک من آیاتنا الایۃ الکبری یعنی ہم تجھے اپنی آیات میں سے بڑی نشانی دکھائیں گے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ید موسیٰ اکبر آیاتہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ اللہ کی بڑی آیات میں سے تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَ اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

"(اب) جائیے فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے۔ آپ نے دعا مانگی: اے میرے پروردگار! کشادہ فرما دے میرے لیے میرا سینہ اور آسان فرما دے میرے لیے میرا یہ (کٹھن) کام اور کھول دے گرہ میری زبان کی تا کہ اچھی طرح سمجھ سکیں وہ لوگ میری بات۔ اور مقرر فرما میرا وزیر خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ مضبوط فرما دے اس سے میری کمر۔ اور شریک کر دے اسے میری (اس) مہم میں، تا کہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور ہم کثرت سے تیرا ذکر کریں۔ بیشک تو ہمارے (ظاہر و باطن کو) خوب دیکھنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید سے مانوس کر دیا اور اسے معجزات دکھا دیئے جو ان کے رسول ہونے پر دلیل تھے تو انہیں فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا کہ اسے دعوت دیں۔ طَغٰى کا معنی ہے اس نے نافرمانی کی، تکبر کیا، کفر کیا، جبر کیا اور حد سے بڑھا۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ رسالت کی تبلیغ کے لیے اعانت طلب کی۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا تھا کہ اس نے فرعون کے دل پر مہر لگا دی ہے وہ ایمان نہیں لائے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: یا رب! تو مجھے کیسے حکم دیتا ہے کہ میں اس کے پاس جاؤں جبکہ تو نے اس کے دل پر مہر لگا دی ہے؟ تو ہوا کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ آیا اور کہا: اے موسیٰ! اس کی طرف چلو جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ یعنی میرا سینہ کشادہ فرما اور ایمان اور نبوت سے منور کر دے۔ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ اور فرعون کو تبلیغ کرنے کا جو تو نے مجھے حکم دیا ہے اسے میرے لیے آسان فرما۔ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ عقدہ سے مراد وہ گرہ ہے جو اس انگارے کی وجہ سے بن گئی تھی جو آپ نے بچپن میں منہ میں ڈال لیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کی زبان میں لکنت تھی یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دن فرعون کی گود میں تھے تو آپ نے فرعون کو طمانچہ مارا اور اس کی داڑھی سے پکڑ کر اسے نوچا۔ فرعون نے آسیہ سے کہا: یہ میرا دشمن ہے۔ ذبح کرنے والوں کو بلا۔ آسیہ نے کہا: ٹھہر جا، یہ معصوم بچہ ہے چیزوں میں تفریق بھی نہیں کر

سکتا۔ پھر آسیہ دو تھال لے آئی ایک میں اس نے انگارے رکھے اور دوسرے میں جواہر رکھے۔ حضرت جبریل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور اسے آگ پر رکھ دیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انگارہ اُٹھایا اور اسے اپنے منہ میں زبان پر رکھ دیا اس کی وجہ سے آپ تتلاتے تھے۔

روایت ہے کہ آپ کا ہاتھ جل گیا تھا۔ فرعون نے اس کے علاج کی کوشش کی تھی لیکن وہ ٹھیک نہ ہوا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی تو اس نے کہا: تو مجھے کونسے رب کی طرف بلاتا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اس رب کی طرف جس نے میرے ہاتھ کو ٹھیک کیا تھا جبکہ تو اس کے علاج سے عاجز ہو گیا تھا۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ آپ کا ہاتھ اس لیے ٹھیک نہ ہوا تھا تاکہ آپ کا ہاتھ فرعون کے ساتھ ایک پلیٹ میں داخل نہ ہو اور ان کے درمیان اکٹھا کھانے کی حرمت منعقد ہے۔ پھر علماء کا اختلاف ہے کہ آپ کا وہ تتلاپن ختم ہو گیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: زائل ہو گیا تھا اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی بعض نے فرمایا: یہ تتلاپن قائم رہا تھا، اس کی دلیل فرعون کا یہ قول ہے: وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ۝ (الزخرف) اور آپ نے یہ دعا نہیں کی: أحلل کل لسانی، یہ دلیل ہے کہ آگ کو چھونے کی وجہ سے گرہ ان کی زبان میں تھی۔ بعض نے فرمایا: کلیۃً یہ تکلیف زائل ہو گئی تھی، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ، فرعون نے کہا: وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ۝ کیونکہ تربیت کے دوران آپ کی گرہ کا اسے علم تھا اور اس تکلیف کے دور ہونے کا اس کے پاس ثبوت نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو فرعون وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ۝ نہ کہتا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فصیح زبان سے کلام کی ہوتی؛ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ گرہ اپنے رب سے مناجات کرتے وقت پڑی تھی حتیٰ کہ آپ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے سے کلام نہیں کر سکتے تھے۔ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ تاکہ وہ اسے جان لیں جو میں کہوں اور اسے سمجھ لیں۔ کلام عرب میں الفقه کا معنی فہم (سمجھنا) ہے۔ اعرابی نے عیسیٰ بن عمر کو کہا: شهدت علیك بالفقه؛ اسی سے ہے فَقِهَ الرجل (بکسر عین کلمہ) فلان لا یفقه ولا ینقه، أفقهتك الشئ۔ پھر علم شریعت کے لیے خاص ہوا۔ شریعت کا جاننے والا فقیہ ہوتا ہے۔ فَقُهَ (عین کلمہ کے ضم کے ساتھ) فقاهة وفقهه الله جب اللہ تعالیٰ کسی کو سمجھ عطا فرمائے اور وہ سمجھ جائے۔ فاقهته جب تو نے علم میں بحث کی۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ الوزیر، الموازر، جیسے الأكیل المواكل ہے کیونکہ وہ سلطان سے اس کا بوجھ اُتار دیتا ہے۔

کتاب النسائی میں ہے قاسم بن محمد سے مروی ہے میں نے اپنی پھوپھو کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تم میں سے کسی منصب پر فائز کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا تو اس کے لیے نیک وزیر بنا دیتا ہے اگر وہ بھولتا ہے تو وہ وزیر اسے یاد دلاتا ہے اگر اسے بات یاد ہوتی ہے تو اس کی معاونت کرتا ہے''(1)۔ اسی مفہوم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا اور کوئی خلیفہ نہیں بنایا مگر اس کے دو مشیر ہوتے ہیں ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اسے نیکی پر ابھارتا ہے اور ایک مشیر اسے شر کا حکم دیتا ہے اور شر پر برانگیختہ کرتا ہے۔ محفوظ وہی ہے جسے اللہ

1۔ ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب فی اتخاذ الوزیر، حدیث نمبر 2543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے محفوظ کر لیا''۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ اس کا وزیر بنا دے مگر انہوں نے یہ ارادہ نہ کیا کہ وہ وزارت پر مقصور ہوتا کہ وہ نبوت میں اس کا شریک نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بغیر سوال کے اس کا وزیر بنانا جائز ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے متعین فرمایا اور کہا: ھارون، ھارون پر نصب وزیراً سے بدل کی بنا پر ہے یا یہ اِجْعَلْ کی وجہ سے منصوب ہے یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اجعل لی ھارون أخی وزیراً۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک سال بڑے تھے بعض نے کہا: تین سال بڑے تھے۔

اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾ یعنی میری پیٹھ کو مضبوط کر دے۔ الازر کا معنی ازار باندھنے کی جگہ ہے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ میرا نفس مضبوط ہو جائے۔ الازر کا معنی قوت ہے۔ آزرہ کا معنی ہے اس نے اسے قوت بخشی۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ** (الفتح:29) ابو طالب نے کہا:

أليس أبونا هاشمٌ شدَّ أَزْرَهُ وأوصى بنيه بالطِّعانِ وبالضَّرْبِ

بعض نے کہا: الازر کا معنی مدد ہے، یعنی وہ مدد بنا دے جس کے ساتھ میرا معاملہ سیدھا ہو۔ شاعر نے کہا:

شَدَدتُ به أَزْرِی وأَيْقَنْتُ أَنَّهُ أخو الفقر مَن ضاقت عليه مذاهبُه

حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہما السلام سے زیادہ پر گوشت تھے اور زیادہ قد آور تھے اور ان کا جسم زیادہ سفید تھا اور زیادہ فصیح تھے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال پہلے وصال فرما گئے تھے۔ حضرت ہارون کے چہرے میں علامت تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناک کی بینی پر علامت تھی اور زبان کی ایک طرف پر علامت تھی نہ آپ سے پہلے کسی کی یہ علامت تھی اور نہ آپ کے بعد کسی کی ایسی علامت ہوگی۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کی زبان میں گرہ کا سبب تھی؛ واللہ اعلم۔

وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۲﴾ یعنی نبوت اور تبلیغ رسالت میں اسے شریک کر دے۔ مفسرین نے فرمایا: حضرت ہارون علیہ السلام مصر میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہارون کے پاس آنے کا حکم دیا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو مصر میں وحی فرمائی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کریں تو ایک منزل پر ان کی ملاقات ہوئی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے اس کے متعلق بتایا جو ان کی طرف وحی کی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا ہے میں نے اپنے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ تجھے میرے ساتھ رسول بنا دے۔ عام قراء نے أخی اشدد ہمزہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور أشرکہ کو دعا کی بنا پر ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی أَشْدِدِ یارب أزری و أشرِکہ معی لی أمری۔ ابن عامر، یحییٰ بن حرث، ابوحیوہ، حسن اور عبداللہ بن ابی اسحاق نے اشدد کو ہمزہ قطعی کے ساتھ اور أشرکہ کو ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں ایسا کروں گا اور میں اس کے ساتھ اپنے آپ کو مضبوط کروں گا۔ اور اے یارب میں اپنے معاملہ میں شریک کروں گا۔ نحاس نے کہا: دونوں فعل اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا کے قول کی وجہ سے محل جزم میں ہیں۔ یہ قرأت شاذ اور بعید ہے کیونکہ اس کی مثل کا جواب شرط اور جزا کے معنی میں ہوتا ہے۔ پھر معنی ہوگا اگر تو میرے لیے میرے خاندان سے وزیر بنائے گا تو میں اس کے ذریعے مضبوط ہوں گا اور میں اسے اپنے معاملہ میں شریک کروں گا۔ اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام کا امر نبوت اور رسالت تھی۔ یہ آپ کی طرف نہ تھا کہ آپ اس کے متعلق خبر دیتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کو ان کے ساتھ نبوت میں شریک کریں۔ ابن کثیر اور ابوعمرو نے اخی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم تیرے لیے کثرت سے نماز پڑھیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تسبیح باللسان مراد ہو یعنی ہم تیری ہر اس چیز سے پاکیزگی بیان کرتے ہیں جو تیری شان جلال کے موافق و مطابق نہ ہو، كَثِيْرًا مصدر محذوف کی صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وقت کی صفت ہو۔ اور ادغام عمدہ ہے۔ نذ کر کثیرا بھی اسی طرح ہے اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا، خطابی نے کہا: البصیر بمعنی المبصر ہے۔ البصیر وہ عالم جو مخفی امور کو جاننے والا ہو معنی ہے ہمیں جاننے والا۔ اور ہمارے بچپن میں ہمیں نعمتیں بہم پہنچانے والا۔ پس تو نے پہلے بھی ہم پر احسان کیا پس اب بھی ہم پر احسان فرما اے ہمارے رب!۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى ۝ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ اِذْ تَمْشِيْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝

''جواب ملا: منظور کر لی گئی ہے آپ کی درخواست اے موسیٰ۔ اور ہم نے احسان فرمایا تھا تم پر ایک بار پہلے بھی، جب ہم نے وہ بات الہام کی تمہاری ماں کو جو الہام ہی کیے جانے کے قابل تھی۔ یہ کہ رکھ دو اس معصوم بچے کو صندوق میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے دریا ساحل پر پھر پکڑے گا وہ شخص جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچے کا بھی دشمن ہے اور (اے موسیٰ!) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جناب سے (تا کہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے) اور (اس تدبیر کا منشا یہ تھا) کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے۔ یاد کرو جب چلتے چلتے آئی آپ کی بہن اور کہنے لگی (فرعون کے اہل خانہ سے): کیا میں بتاؤں تمہیں وہ آدمی جو اس کی پرورش کر سکے پس (یوں) ہم نے آپ کو لوٹا دیا آپ کی ماں کی طرف تا کہ (آپ کو دیکھ کر) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور غمناک نہ ہو اور (تمہیں یاد ہے جب) تو نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو پس ہم نے نجات دی تھی تمہیں غم و اندوہ سے اور ہم نے تمہیں اچھی طرح جانچ لیا تھا پھر تم ٹھہرے رہے کئی سال اہل مدین میں پھر

تم آ گئے ایک مقررہ وعدہ پر اے موسیٰ۔ اور میں نے مخصوص کر لیا ہے تمہیں اپنی ذات کے لیے۔ اب جایئے آپ اور آپ کا بھائی میری نشانیاں لے کر اور نہ سستی کرنا میری یاد میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى۝ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے شرح صدر اور معاملہ کی تیسیر کا سوال کیا تو جواباً اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اور انہیں ان کی طلب اور مرغوب چیز عطا فرما دی۔ سؤل سے مراد طلب ہے یہ فُعل بمعنی مفعول ہے، خبز بمعنی مخبوز اور اکل بمعنی ماکول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى۝ یعنی اس سے پہلے بھی تم پر ہم نے احسان فرمایا۔ اور وہ احسان دشمنوں کے شر سے آپ کی حفاظت ہے اور یہ ذبح کے وقت تھا؛ واللہ اعلم۔ المنّ کا مطلب احسان کرنا اور مہربانی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰۤى۝ بعض علماء نے فرمایا: اوحینا کا معنی ہے ہم نے الہام کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: حضرت موسیٰ کی والدہ کو خواب میں وحی کی گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح وحی کی گئی جس طرح انبیاء کو وحی کی گئی تھی۔ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ، مقاتل نے کہا: مومن آل فرعون سے تھا جس نے تابوت بنایا تھا اور اسے تیار کیا تھا اس کا نام حزقیل تھا۔ اور تابوت جمیز کی لکڑی کا تھا۔ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ یعنی اسے دریا میں پھینک دے یعنی دریائے نیل میں ڈال دے۔ فَلْيُلْقِهِ، فراء نے کہا: فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ امر کا صیغہ ہے اور اس میں مجازات کا معنی ہے یعنی اقذفیہ یلقہ الیم، اسی طرح یہ ارشاد ہے: اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ (العنکبوت: 12)

يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ یعنی فرعون۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے تابوت بنایا اور اس میں چمڑے کے ٹکڑے لگا دیے اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ اس تابوت کو تارکول لگا دی اور اس کی دراڑیں بند کر دیں پھر اسے دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دریائے نیل سے ایک نہر فرعون کے گھر میں جاتی تھی اللہ تعالیٰ نے اس تابوت کو فرعون کے گھر کی طرف اس نہر میں چلایا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس تابوت میں دھنی ہوئی روئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں رکھا اور اس کو تارکول لگا دی اور سیسہ پھیر دیا پھر اسے دریا میں ڈال دیا۔ اس دریا سے ایک بڑی نہر فرعون کے باغ کو جاتی تھی۔ فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ تالاب کے اوپر بیٹھا تھا کہ اچانک تابوت نظر آیا اس نے تابوت نکالنے کا حکم دیا تو تابوت نکال دیا گیا جب اسے کھولا گیا تو اس میں بچہ تھا جو انتہائی خوبصورت تھا، دشمن خدا اس بچے سے شدید محبت کرنے لگا اور وہ اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتا تھا۔ قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ دریا نے اسے ساحل پر ڈال دیا تھا۔ فرعون نے وہ تابوت ساحل پر دیکھا تھا اور اس نے اسے اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دریا نے ساحل کی اس جگہ پر ڈالا ہو جہاں فرعون کی نہر کا منہ ہو پھر اس نہر کے ذریعے تالاب میں پہنچا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: فرعون کی بیٹی نے اس بچے کو پایا اس بچی کو برص کا مرض تھا جب اس نے تابوت کھولا تو اسے شفا مل گئی۔ روایت ہے کہ جب انہوں نے وہ تابوت اٹھایا اور اس کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ اس پر قادر نہ ہوئے انہوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی تو وہ بھی عاجز آ گئے۔ آسیہ قریب ہوئی اور اس نے تابوت میں نور دیکھا اس نے کوشش کی تو اس نے کھول لیا اس میں ایک بچہ تھا جس کی آنکھوں کے درمیان کی جگہ روشن

تھی اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے انگوٹھے سے دودھ چوس رہے تھے وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت کرنے لگے۔ فرعون کی بیٹی کو برص کا مرض تھا۔ اطباء نے اسے کہا تھا کہ یہ ٹھیک نہ ہوگی مگر دریا کی طرف سے۔ دریا میں ایک انسان کے مشابہ ایک چیز پائی جاتی ہے۔ اس کا علاج اس کا لعاب ہے اس لڑکی نے اپنی برص پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لعاب ملا تو وہ ٹھیک ہوگئی۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اس لڑکی نے موسیٰ علیہ السلام کے چہرہ کو دیکھا تو صحت یاب ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو فرعون کی بیوی کی پڑوسن نے پایا تھا جب فرعون نے اس کو دیکھا تو اس نے تمام لوگوں سے اسے خوبصوت پایا۔ فرعون اس سے محبت کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت فرمائی اور ساری مخلوق کا محبوب بنا دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے پر تو حسن ان پر ڈال دیا تھا جو دیکھ لیتا صبر نہیں کر سکتا تھا۔ قتادہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں میں ملاحت تھی جو دیکھتا محبت و عشق کرنے لگتا تھا۔ عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے تجھ میں میں نے ملاحت و حسن رکھ دیا جو تجھے دیکھے گا تجھ سے محبت کرے گا۔ طبری نے کہا: اس کا مطلب ہے میں نے تجھ پر اپنی رحمت ڈال دی۔ ابن زید نے کہا: اس کا مطلب ہے میں نے تجھے ایسا بنا دیا کہ جو تجھے دیکھے گا تجھ سے محبت کرے گا حتی کہ فرعون نے بھی تجھ سے محبت کی اور میں نے اس کے شر سے تجھے بچا لیا۔ آسیہ بنت مزاحم نے تجھ سے محبت کی اور تجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ یہ میرے سامنے ہوا اس طرح کہ تجھے تابوت میں رکھا گیا اور پھر تابوت کو دریا میں ڈالا گیا اور پھر فرعون کی بیوی کی لونڈی نے تجھے اٹھایا اور انہوں نے تابوت کو کھولنے کا ارادہ کیا تا کہ جو کچھ اس میں ہے اسے دیکھیں، ان میں سے ایک نے کہا: تم اسے مت کھولو حتی کہ تمہاری سردار آجائے وہ اس کے زیادہ لائق ہے تا کہ وہ تم پر تہمت نہ لگائے کہ تم نے اس میں جو کچھ پایا وہ تم نے اپنے لیے اٹھا لیا ہے۔ فرعون کی بیوی پانی نہیں پیتی تھی حتی کہ وہ لونڈیاں اسے پلاتی تھیں وہ تابوت کو بند کر کے اپنی مالکن آسیہ کے پاس لے گئیں جب اس نے اس تابوت کو کھولا تو اس میں ایک ایسا بچہ دیکھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس پر محبت ڈال دی گئی اس نے وہ بچہ اٹھا لیا اور اسے فرعون کے پاس لے گئی اور اسے کہا: یہ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ فرعون نے اسے کہا: ہاں۔ تیری تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے نہیں۔ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر فرعون کہتا کہ ہاں وہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو وہ ایمان لے آتا اور تصدیق کرتا"۔ آسیہ نے کہا: یہ مجھے ہبہ کر دے اور اسے قتل نہ کر۔ فرعون نے وہ اسے ہبہ کر دیا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ کا مطلب ہے تو میرے سامنے پروان چڑھے اور غذا دیا جائے، یہ قتادہ کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ لغت میں معروف ہے، کہا جاتا ہے: صنعت الفرس و امنعته جب تو گھوڑے کی اچھی دیکھ بھال کرے۔ اس کا معنی ہے وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ میں نے یہ کیا۔ بعض نے فرمایا: اللام مابعد کلام اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ کے متعلق ہے اور تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اذ، لِتُصْنَعَ کی ظرف ہے۔ بعض نے فرمایا: وَ لِتُصْنَعَ میں واؤ زائدہ ہے۔ ابن

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

القعقاع نے کہا: وَلْتُصْنَعَ امر کی بنا پر لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ اس کا ظاہر مخاطب ہے اور مامور غائب ہے۔ ابونہیک نے ولتصنع، تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے تا کہ آپ کا حرکت کرنا اور تصرف کرنا میری مشیت سے ہو اور میرے سامنے ہو؛ یہ مہدوی نے قول ذکر کیا ہے۔ اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ، اِذْ تَمْشِیْٓ میں عامل القیت یا تصنع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اِذْ اَوْحَیْنَآ سے بدل ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام مریم تھا۔ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ یَّكْفُلُهٗ یہ اس طرح ہوا کہ وہ اس کی خبر کی تلاش میں نکلی فرعون نے اپنی بیوی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام ہبہ کر دیا تو اس کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دودھ پلانے والیاں طلب کیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی عورت کا دودھ نہیں پیتے تھے حتیٰ کہ ان کی بہن آ گئی اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا اور اپنی گود میں لیا اور پستان منہ میں دیا تو دودھ پینے لگ گئے اور وہ خوش ہو گئے۔ فرعون کے گھر والوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا: تو ہمارے پاس ٹھہرے گی؟ اس نے کہا: میرا دودھ نہیں ہے لیکن میں تمہیں ایسے گھر کے متعلق آگاہ کرتی ہوں جو اس کی کفالت کرے گا اور وہ لوگ اس کے لیے نہایت مخلص ہوں گے۔ انہوں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ اس نے کہا: میری والدہ۔ انہوں نے پوچھا: کیا اس کا دودھ ہے؟ اس نے کہا میرے بھائی ہارون کا دودھ۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک سال بڑے تھے۔ بعض نے کہا: تین سال۔ بعض نے کہا: چار سال بڑے تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ فرعون نے بنی اسرائیل پر رحم کیا اور چار سال ان کے بچوں کو قتل کرنا چھوڑ دیا تھا اسی دوران حضرت ہارون پیدا ہوئے تھے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ حضرت موسیٰ کی والدہ آئی تو انہوں نے ان کا دودھ قبول کر لیا۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے: فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ، حضرت ابی کے مصحف میں فرددناك ہے۔ عبدالمجید نے ابن عامر سے روایت کیا ہے کی تقرعینها قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ جوہری نے کہا: وقررت به عینا وقررت به قرة وقرورا فيهما، رجل قرير العين، وقد قرت عينه، تَقِرُ و تَقَرُ یہ گرم ہونے کی نقیض ہے۔ اقر الله عینه یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا حتیٰ کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہوئی۔ پس اپنے سے اوپر والے کو مت دیکھو۔ کہا جاتا ہے: حتی تبرد ولا تسخن حتیٰ کہ ٹھنڈا ہو گیا اور گرم نہ رہا۔ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور پریشانی کے آنسو گرم ہوتے ہیں۔ یہ مفہوم سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ وَلَا تَحْزَنَ یعنی اپنے مفقود ہونے پر پریشان نہ ہو۔ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس کو آپ نے قتل کیا وہ قبطی کافر تھا۔ کعب نے کہا: وہ اس وقت بارہ سال کا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے: ''اس کا قتل کرنا خطا تھا'' جیسا کہ آگے آئے گا۔ فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ یعنی ہم نے تجھے خوف، قتل اور حبس سے امن دیا۔ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا یعنی ہم نے تجھے آزمایا حتیٰ کہ آپ رسالت کے لیے تیار ہو گئے۔ قتادہ نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم نے تمہیں آزمائش میں ڈالا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے تجھے خالص کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم نے رسالت سے پہلے کئی چیزوں کے ساتھ آزمایا۔ اس سال والدہ نے انہیں بطن میں اٹھایا جس سال میں فرعون بچوں کو قتل کرتا تھا۔ پھر انہیں دریا میں ڈالنا، پھر اپنی والدہ کے علاوہ کسی عورت کا دودھ پینے سے روک دینا پھر فرعون کی داڑھی پکڑ کر کھینچنا، پھر موتی کے بدلے انگارے کو پکڑنا، پھر فرعون کے قتل سے نجات دینا، پھر قبطی کو قتل کرنا، پھر خائف ہو کر نکل جانا پھر بکریاں چرانا تا کہ مخلوق کی

رعایت کرنے کی مشق کرلیں۔ کہا جاتا ہے: بکری کا ایک بچہ بھاگ گیا تو آپ دن کا اکثر حصہ اس کے پیچھے لگے رہے اس نے آپ کو تھکا دیا پھر اسے پکڑا تو اسے بوسہ دیا اور اپنے سینے سے لگایا اور کہا: تو نے مجھے بھی تھکا دیا اور خود بھی تھک گیا اور آپ اس پر ناراض نہ ہوئے۔ وہب بن منبہ نے کہا: اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کلیم بنایا۔ سورۂ نساء میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ آپ نے لمبی مدت دس سال پوری کی۔ وہب نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت شعیب کے پاس اٹھائیس سال رہے ان میں سے دس سال ان کی بیوی صفورا بنت شعیب کا مہر تھا۔ اور اٹھارہ سال آپ ویسے حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس ٹھہرے یہاں کہ ان کے ہاں ان کی اولاد ہوگئی۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۞ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور عبدالرحمن نے کہا: اس کا مطلب ہے نبوت و رسالت کے لیے موافق ہو گئے، کیونکہ انبیاء کرام چالیس سال کی عمر میں مبعوث کیے جاتے ہیں۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا: عَلٰى قَدَرٍ کا معنی ہے وعدہ پر۔ محمد بن کعب نے کہا: پھر تو اس مقدار پر ہو گیا جو تیری لیے مقدر کی گئی تھی کہ تو اس میں آئے۔ مفہوم دونوں اقوال کا ایک ہی ہے، یعنی آپ اس وقت آئے جس میں ہم نے تجھے بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ شاعر نے کہا تھا:

نال الخلافة أو كانت له قَدَراً　　كما أَتَى ربَّه موسىٰ على قَدَر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۞ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم نے اپنی وحی اور رسالت کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔ بعض نے فرمایا: اصْطَنَعْتُكَ کا معنی ہے میں نے تجھے پیدا کیا۔ یہ الصنعة سے ماخوذ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے میں نے تجھے قوت دی اور علم سکھایا تاکہ آپ میرا حکم اور میری نہی میرے بندوں تک پہنچائیں۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد نو آیات ہیں جو آپ پر نازل کی گئیں۔ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۞ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: امر رسالت میں کمزور نہ ہونا؛ اور یہ قتادہ کا بھی قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے سست نہ ہونا۔ شاعر نے کہا:

فما وَنَى محمدٌ مُذان غَفَرْ　　له الإلٰه مامَضَى وما غَبر

الونی کا مطلب کمزوری اور سستی ہے اور تھک جانا اور عاجز آجانا ہے۔ اس آیت میں یہ سب معانی مراد ہو سکتے ہیں۔

امرء القیس نے کہا:

مِسَحٍّ إذا ماالسابحاتُ على الونَى　　أَثَرن غُبَاراً بالكَدِيدِ المركَّلِ

کہا جاتا ہے: ونيت فی الأمر ونیٌ وونیاً جس کا معنی ہے کمزور ہونا، فأنا وانٍ وناقةٌ وانية (کمزور اونٹنی) أونيتها أنا میں نے اونٹنی کو تھکا دیا اور کمزور کر دیا۔ فلان لاينی كذا یعنی فلاں ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ابان نے آیت کے معنی کی تفسیر بیان کی ہے اور طرفہ کے قول سے استشہاد کیا ہے:

كأن القُدُورَ الراسياتِ أَمامَهُمْ　　قبابٌ بَنَوْها لاتَنِي أبداً تَغْلِي

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے: لاتبطئا (سست نہ ہونا) حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے: ولاتهنا فی

ذکری یعنی میری حمد بیان کرنے، میری بزرگی بیان کرنے اور میرے پیغام کو پہنچانے میں کوتاہی وسستی نہ کرنا۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

"آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے۔ اور گفتگو کریں اس کے ساتھ نرم انداز سے شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْهَبَآ، آیت کے آغاز میں فرمایا: اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ اور یہاں فرمایا: اِذْهَبَآ۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کو دعوت پہنچانے کا حکم دیا پہلے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علیحدہ خطاب فرمایا ان کو شرف بخشنے کے لیے پھر تاکید کے لیے مکرر فرمایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے واضح کیا کہ ایک کا جانا کافی نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: پہلا تمام لوگوں کی طرف جانے کا حکم تھا اور دوسرا حکم فرعون کی طرف جانے کا تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز کی دلیل ہے۔ اور اس شخص سے نرمی سے بات ہونی چاہیے جو قوت و مرتبہ والا ہو اور اس کے لیے عصمت ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا اور فرمایا: لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۝ جب حضرت موسیٰ کلیم اور حضرت ہارون علیہما السلام کی یہ حالت ہے تو ہماری کیا کیفیت ہوگی، ہم اس کیفیت سے تبلیغ کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس وقت امر و نہی کا فریضہ مرغوب انداز میں ہوگا اور مطلوب حاصل ہوگا۔ یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ لَّيِّنًا کے قول میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا جس میں کلبی اور عکرمہ بھی ہیں کہ اس کا معنی ہے اس کو کنیت سے بلاؤ؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: فرعون کی کنیت ابوالعباس تھی۔ بعض نے فرمایا: ابوالولید تھی۔ بعض نے فرمایا: ابومرۃ تھی، اس قول کی بنا پر کافر سے کنایۃً بات کرنا جائز ہے جب کہ وہ وجیہ اور شرف والا ہو اور اسکے اسلام قبول کرنے کی امید ہو۔ اور یہ جائز ہے جبکہ اس کے اسلام قبول کرنے کی امید نہ بھی ہو کیونکہ طمع اور امید اس عمل کو ثابت نہیں کرتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تمہارے پاس کسی قوم کا کریم (معزز) شخص آئے تو اس کا احترام کرو" (1)۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس کے اسلام قبول کرنے کی امید ہو۔ اور اس کے اکرام میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی کنیت ذکر کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ سے کہا: انزل اباوھب، اے ابووہب! نیچے اترو۔ حضرت سعد کو عبداللہ بن ابی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: الم تسمع ما یقوله أبوحباب، ابوحباب، عبداللہ بن ابی کی کنیت ہے۔ اسرائیلیات میں مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک سال فرعون کے دروازے پر کھڑے رہے انہوں نے کوئی پیغام رساں نہ پایا جو ان کی کلام فرعون تک پہنچا تا حتی کہ خود فرعون باہر نکلا تو پھر یہ سارا واقعہ پیش آیا۔ یہ بعد میں آنے

1۔ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ، حدیث نمبر 3701، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والے کے لیے تسلی ہے جن کا معاملہ ظالموں کے ساتھ ہو تمہارا رب ہدایت یافتہ لوگوں کو زیادہ جانتا ہے۔ **بعض** نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا: تو ایمان لے آ اس پر جو میں لے کر آیا ہوں اور تو رب العالمین کی عبادت کر، اس پر کہ تیرے لیے ایسی جوانی ہوگی جو موت تک بوڑھا نہیں کرے گی اور ایسی ملکیت پر جو تجھ سے موت تک چھینی نہیں جائے گی۔ اور تیرے عمر میں چار سو سال اضافہ ہو جائے گا اور جب تو مرے گا تو جنت میں داخل ہوگا۔ یہ قول لین ہے، حضرت ابن مسعود نے فرمایا: القول اللین سے مراد یہ ارشاد ہے: فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ (النازعات) **بعض** نے فرمایا: قول لین سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ہے: اے فرعون! ہم تیرے پروردگار، تمام جہانوں کے پروردگار کے پیغام رساں ہیں۔ آپ نے اس کا یہ نام لیا کیونکہ باقی اسماء میں سے یہ نام اسے زیادہ پسند تھا جس طرح ہمارے ہاں الملک (بادشاہ) کو نام دیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: القول اللین سے مراد وہ قول ہے جس میں خشونت نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: یلین لیناً، شئی لی ولین مخفف ہے اور اس کی جمع الیناء ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نرم لہجہ میں بات کرنے کا حکم دیا گیا تو جو ان سے کم مرتبہ ہیں ان کے لیے بدرجہ اولیٰ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے خطاب میں اس معاملہ کی اقتدا کرے اور کلام میں نرمی کا مظاہرہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ: 83) اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ اس کا معنی ہے تمہاری امید اور تمہاری رجا پر۔ اس میں توقع جہت بشر کی طرف راجع ہے؛ بڑے بڑے نحوی علماء اور سیبویہ وغیرہ نے یہ کہا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ مفہوم گزر چکا ہے۔ زجاج نے کہا: لعل لفظ طمع اور ترجی ہے، پس اس کے ساتھ عقلمندوں کو خطاب کیا جاتا ہے۔ **بعض** نے کہا: لعل یہاں استفہام کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے: فانظر هل يتذكر، یعنی دیکھ کیا وہ نصیحت حاصل کرتا ہے۔ **بعض** نے کہا: یہ کئی کے معنی میں ہے۔ **بعض** نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا شاید وہ نصیحت حاصل کرے اور ڈرنے لگے؛ یہ حسن کا قول ہے۔ **بعض** نے کہا: لعل اور عسیٰ تمام قرآن میں اس معنی کے لیے آئے ہیں جو واقع ہو چکا ہو۔ فرعون نے اس وقت نصیحت حاصل کی جب وہ غرق ہونے لگا اور اس وقت ڈرا اور کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ (یونس) لیکن اس وقت کے ایمان نے اسے نفع نہیں دیا؛ یہ ابو بکر وراق وغیرہ کا قول ہے۔ یحییٰ بن معاذ نے اس آیت میں فرمایا: یہ تیری اس پر مہربانی ہے جو کہتا ہے: میں الٰہ ہوں، پھر اس پر تیری کتنی بندہ نوازی ہوگی جو کہتا ہے: تو الٰہ ہے۔ **بعض** نے فرمایا: فرعون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی طرف مائل ہوا جب آپ نے اسے دعوت دی اور اپنی بیوی سے مشورہ کیا وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی اور ایمان لانے کا مشورہ دیا پھر اس نے ھامان سے مشورہ کیا تو اس نے کہا: تو ایسا نہ کر تو بادشاہ ہونے کے بعد غلام بن جائے گا، تو رب ہونے کے بعد مربوب ہو جائے گا اور اسے کہا: میں تجھے جوانی کی طرف لوٹاؤں گا۔ اس نے اس کی داڑھی میں سیاہ خضاب لگایا اور یہ پہلا شخص تھا جس نے سیاہ خضاب لگایا تھا۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾

''دونوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! ہمیں یہ خوف ہے کہ وہ دست درازی کرے گا ہم پر یا سرکشی سے پیش آئے گا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾ ضحاک نے کہا: یفرط کا معنی تجاوز کرنا ہے۔ نحاس نے کہا: یفرط علینا منه امر ہمیں اندیشہ ہے کہ اس کی طرف سے ہم پر تجاوز ہوگا۔ فراء نے کہا: اس کی طرف سے امر جلدی ہوگا۔ فراء نے کہا: افرط کا معنی اسرع (جلدی کرنا) ہے اور فرمایا: فرط کا معنی چھوڑ دینا ہے اور جمہور کی قرأت یفرط یاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے ہمیں سزا دینے میں وہ جلدی کرے گا۔ کہا جاتا ہے: فرط منی امر جلدی ہوا۔ اسی سے الفارط الی الماء ہے، وہ شخص جو پانی تک لوگوں سے پہلے پہنچ جاتا ہے یعنی وہ ہمیں گناہ میں سبقت لے جانے والے کے عذاب کی طرح عذاب دے گا؛ یہ مبرد کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے یفرط یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان میں ابن محیصن بھی ہے۔ مہدوی نے کہا: شاید یہ بھی ایک لغت ہو ان سے یاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اس کا معنی ہے اسے ہم پر جلدی کرنے پر ابھارنے والا ابھارے گا۔ ایک گروہ نے یفرط یاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ اور ابن محیصن نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ ہمیں اذیت دینے میں زیادتی کرے گا۔ راجز نے کہا:

قد أفرط العِلجُ علينا وعجل

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾

''ارشاد ہوا: ڈرو نہیں میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بتقاضائے بشریت اپنے نفسوں پر خوف لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمایا کہ فرعون ان تک اور ان کی قوم تک نہیں پہنچے گا۔ یہ آیت اس کے قول کا رد کرتی ہے جو کہتا ہے: وہ نہیں ڈرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انبیاء و اولیاء میں سنت ہے کہ انہیں دشمنوں کا خوف ہوتا ہے حالانکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر وثوق اور یقین ہوتا ہے۔ بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا جب عامر بن عبد اللہ کے متعلق خبر دینے والے کو کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شام کے راستے پر پانی پر اترا ہے اور ان کے درمیان اور پانی کے درمیان ایک شیر حائل ہو گیا ہے۔ عامر پانی کی طرف آیا اور اس سے اپنی حاجت پوری کی۔ عامر کو کہا گیا: کیا تو نے اپنے اندر خطرہ محسوس کیا؟ تو عامر نے کہا: میرے پیٹ میں نیزے لگیں تو میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ میں اس کے سوا کسی چیز سے ڈرتا ہوں، جبکہ وہ بھی بتقاضائے بشریت ڈرے تھے جو عامر سے بہتر تھے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان سے ایک شخص نے کہا تھا: اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ

مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۖ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (القصص) اور فرمایا: فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ (القصص) اور جب جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکی تو فرمایا: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝۔

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کے اردگرد خندق کھودی تاکہ مسلمان اور ان کے اموال محفوظ ہو جائیں جبکہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور وثوق میں ایسے مقام پر فائز تھے جس پر کبھی کوئی پہنچا ہی نہیں پھر آپ کے صحابہ کرام جن سے کوئی ناواقف نہیں کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ایک مرتبہ حبشہ کی طرف گئے اور پھر مدینہ طیبہ کی طرف گئے کیونکہ انہیں مشرکین مکہ سے اپنی جانوں کا خطرہ تھا اور اس لیے چلے گئے تھے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ انہیں عذاب دے کر انہیں دین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا کر دیں گے۔ اسماء بنت عمیس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا جب انہوں نے اسے کہا تھا: ہم تم سے ہجرت میں سبقت لے گئے ہیں اس لیے ہم رسول اللہ ﷺ کے تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ اسماء نے کہا: اے عمر! تو نے غلط کہا ہے ہرگز نہیں اللہ کی قسم! تم نبی پاک ﷺ کے ساتھ تھے وہ تمہارے بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے، تمہارے جاہلوں کو وعظ کرتے تھے اور ہم دور والی زمین میں تھے جس میں دین اسلام سے نفرت کی جاتی تھی یعنی ہم حبشہ میں تھے اور یہ سب کچھ ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے برداشت کیا۔ اللہ کی قسم! میں نہ کھانا کھاؤں گی اور نہ پانی پیوں گی حتیٰ کہ میں رسول اللہ ﷺ سے وہ عرض کرلوں جو تو نے کہا ہے، ہم اذیت دیئے جاتے تھے اور ہم ڈرتے تھے۔ یہ طویل حدیث ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ علماء نے فرمایا: اپنی ذات کے متعلق خبر دینے والا جھوٹا ہے سوائے ان باتوں کے جو اللہ تعالیٰ نے نفوس کے اندر پیدا کر دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے کہ وہ تکلیف دینے والی، اذیت دینے والی اور تلف کرنے والی چیزوں سے ڈرتا ہے۔ علماء نے فرمایا: درندے سے بڑا ضرر نہیں ہے جو انسان پر جنگل میں حملہ کرنے والا ہے اور اس کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے لیے تلوار، نیزہ، تیر وغیرہ بھی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ یعنی فرعون کے خلاف میں تمہاری مدد اور نصرت کروں گا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں: الامیر مع فلاں جب امیر اس کی حفاظت کرنے والا ہو۔ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ یہ اس ادراک سے عبارت ہے جس کے ساتھ کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی۔ اللہ رب العالمین کی ذات بڑی بابرکت ہے۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

’’پس (بے خوف وخطر) اس کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ: ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں پس بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور انہیں (اب مزید) عذاب نہ دے، ہم لے آئے ہیں تیرے پاس ایک نشانی تیرے رب کے پاس سے، اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ بیشک وحی کی گئی ہے ہماری طرف کہ عذاب (خداوندی) اس پر آئے گا جو جھٹلاتا ہے (کلام الٰہی کو) اور روگردانی کرتا ہے۔ فرعون نے پوچھا: موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ فرمایا: ہمارا رب وہ ہے جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصد تخلیق کی طرف) ہر چیز کی راہنمائی کی‘‘۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ اس کلام میں حذف ہے معنی یہ ہے کہ وہ فرعون کے پاس آئے اور اسے یہ کہا: فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ یعنی ان کو چھوڑ دے۔ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ محنت ومشقت اور کام میں تھکانے کے ساتھ۔ بنو اسرائیل فرعون کے پاس سخت عذاب میں تھے وہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں سے خدمت لیتا تھا۔ اور مٹی اور اینٹیں بنانے اور شہر تعمیر کرنے کی تکلیف مالایطاق دیتا تھا۔ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت سے مراد عصا اور ہاتھ ہے۔ بعض نے فرمایا: فرعون نے پوچھا وہ نشانی کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں داخل کیا پھر اسے سفید نکالا اس کی سورج کی شعاع کی طرح شعاع تھی اس ہاتھ کا نور سورج کے نور پر غالب آ گیا۔ اور اس سے اس نے تعجب کیا اور عصا کا معجزہ نہیں دکھایا مگر میلہ کے دن۔ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۝ زجاج نے کہا: جس نے ہدایت کی اتباع کی وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچ گیا۔ اور فرمایا: یہ سلام نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ملاقات کی ابتدا نہیں ہے اور خطاب نہیں ہے۔ فراء نے کہا: وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۝ اور لمن اتبع الهدى برابر نہیں۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ یعنی دنیا میں ہلاکت وبربادی اور آخرت میں جہنم میں ہمیشہ رہنا۔ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ اس پر ہے جس نے انبیاء کرام کو جھٹلایا۔ تَوَلّٰى اور ایمان سے اعراض کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت موحدین کے لیے امید افزا ہے کیونکہ انہوں نے نہ جھٹلایا اور نہ اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى۝ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا حضرت ہارون علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا تاکہ آیات کے سرے مل جائیں۔ بعض نے فرمایا: ذکر کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص فرمایا کیونکہ وہ رسالت اور کلام اور معجزہ والے تھے۔ بعض نے فرمایا: دونوں نے پیغام پہنچایا اگرچہ حضرت ہارون علیہ السلام خاموش تھے، کیونکہ کلام کے وقت ایک شخص بات کرتا ہے۔ جب ایک کلام ختم کرتا ہے تو دوسرا اس کی تائید کرتا ہے اور اسے تقویت دیتا ہے۔ پس اس بنا میں ہمارے لیے ایک علمی فائدہ ہے کہ دو شخصوں کو کوئی کام سپرد کیا جائے اور پھر ایک ادا کر دے جبکہ دوسرا وہاں موجود ہو اس وقت وہ اس سے مستغنی ہو تو وہ کام دونوں کا ادا کرنا شمار ہوگا اور دونوں عوض اور بدل کے مستحق ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اور پھر فرمایا: اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ اور فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ دونوں کو جانے اور بات کرنے کا حکم دیا۔ پھر فَمَنْ رَّبُّكُمَا کے قول سے خطاب نے ہمیں بتایا کہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے۔ قَالَ، حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ یعنی وہ اپنی صفات کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔ اس کا کوئی اسم علم نہیں حتی کہ کہا جائے کہ وہ فلاں ہے بلکہ وہ عالم کا خالق ہے اس نے ہر مخلوق کو اپنی ہیئت اور صورت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اگر خطاب دونوں کے ساتھ ہوتا تو کلام یوں ہوتی: قالا ربنا اور خلقه، اعطی کا مفعول اول ہے یعنی اس نے ہر مخلوق کو ہر وہ چیز دی جس کے وہ محتاج تھے اور جس کی انہیں ضرورت تھی یا یہ مفعول ثانی ہے یعنی اس نے ہر چیز کو اس کی وہ صورت اور شکل دی جو اس منفعت کے مطابق تھی جو اس کے متعلق تھی جیسا کہ ضحاک کا قول ہے جو آگے آرہا ہے۔ ثُمَّ هَدٰی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر اور سدی نے کہا: اس کا مطلب ہے اس نے ہر چیز کو اس کی جنس سے اس کا جوڑا دیا پھر اس کی نکاح کرنے، کھانے پینے اور رہنے کی طرف راہنمائی کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: پھر اس کی الفت، اجتماع اور مناکحت کی طرف راہنمائی کی۔ حسن اور قتادہ نے کہا: ہر چیز کو اس کی اصلاح دی اور جو اس کے لیے مناسب تھا اس کی طرف راہنمائی کی۔ مجاہد نے کہا: اس نے ہر چیز کو صورت دی اور انسان کی صورت، حیوانوں کی تخلیق پر نہیں بنائی اور نہ حیوانوں کی تخلیق انسانوں کی تخلیق پر بنائی لیکن اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ایک مخصوص اندازے سے بنایا۔ شاعر نے کہا:

وله فی کلِّ شیءٍ خِلقَةٌ وکذاک الله ماشاء فَعَلْ

یعنی جس صورت پر تخلیق کرنا چاہا کر دیا؛ یہ عطیہ اور مقاتل کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: اس نے ہر چیز کو اس منفعت کے ساتھ پیدا کیا جو اس کے متعلق تھی اور اس کے مطابق تھی یعنی ہاتھ کو پکڑنے کے لیے، پاؤں کو چلنے کے لیے، زبان کو بولنے کے لیے، آنکھ کو دیکھنے کے لیے، کان کو سننے کے لیے پیدا کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر چیز کو علم یا صنعت الہام کی۔ فراء نے کہا: مرد کو عورت کے لیے تخلیق کیا اور ہر مذکر کے لیے اس کے موافق مونث پیدا کی۔ ہر مذکر کو عورت کے لیے راہنمائی کی اس تقدیر پر مطلب ہوگا: أعطی کلّ شیء مثل خلقه ہر چیز کو اس کی تخلیق کی مثل عطا کی۔

میں کہتا ہوں: یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا معنی ہے۔ آیت کریمہ عام ہے۔ زائدہ نے اعمش سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ یعنی لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ یہ ابن ابی اسحق کی قرأت ہے۔ اور نصیر نے کسائی وغیرہ سے یہ روایت کیا ہے یعنی بنی آدم کو ہر چیز عطا کی وہ اس نے پیدا کی جس کے وہ محتاج تھے۔ دونوں قرأتیں معنی میں متفق ہیں۔

قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰی ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی ﴿۵۲﴾

''اس نے کہا: (اچھا یہ بتاؤ) کیا حال ہوا پہلی قوموں کا۔ فرمایا: ان کا علم میرے رب کے پاس ہے جو کتاب میں (مرقوم) ہے نہ بھٹکتا ہے میرا رب اور نہ (کسی چیز کو) بھولتا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَمَا بَالُ، البال سے مراد حالت ہے یعنی کیا حال ہوا اور کیا شان ہوئی، تو

بتایا کہ اس کا علم تو الله تعالیٰ کے پاس ہے، یعنی یہ علم غیب سے ہے جس کے متعلق تو نے سوال کیا ہے۔ اور یہ وہ ہے جس کو الله تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کیا ہے اس کو کوئی نہیں جانتا سوائے الله تعالیٰ کے اور میں نہیں ہوں مگر تیری مثل بندہ، میں نہیں جانتا مگر جس کے متعلق مجھے وہ علام الغیوب خبر دے، گزشتہ قوموں کے احوال کا علم الله کی بارگاہ میں لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔
بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے پہلی قوموں کا کیا حال ہوا جنہوں نے توحید و رسالت کا اقرار نہیں کیا یعنی ان کا کیا حال ہوا جو گزر گئے اور انہوں نے تیرے رب کے علاوہ معبودوں کی عبادت کی۔ بعض نے فرمایا: اس نے پہلی قوموں کے اعمال کے متعلق پوچھا تو بتایا کہ وہ الله کی بارگاہ میں شمار کیے گئے ہیں اور اس کے پاس کتاب میں محفوظ ہیں، یعنی وہ اعمال لکھے ہوئے ہیں وہ انہیں عذاب اور جزا دے گا۔ یہاں الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ کتاب ہے جو ملائکہ کے پاس ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اور اس کی مثل دوسری آیات جو گزر چکی ہیں اور جو آگے آئیں گی علوم کو مدون کرنے اور ان کو لکھنے پر دلالت کرتی ہیں تاکہ علوم بھول نہ جائیں کیونکہ کبھی حفظ کو غلطی اور نسیان جیسی آفات لاحق ہوجاتی ہیں اور کبھی انسان اسے یاد نہیں رکھتا جو وہ سنتا ہے تاکہ وہ اسے مقید کرے تاکہ ضائع نہ ہو جائے۔ ہم نے قتادہ سے متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا ہم تیرے جیسے لوگوں سے جو سنیں اسے لکھ لیں؟۔ اس نے کہا: تمہیں لکھنے سے کیا مانع ہے جبکہ الله تعالیٰ جو لطیف و خبیر ہے اس نے خود خبر دی ہے کہ وہ لکھتا ہے فرمایا: قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب الله تعالیٰ نے مخلوق کا فیصلہ فرمایا تو کتاب میں اپنے اوپر لکھا اور وہ اس کے پاس رکھا ہوا ہے کہ میری رحمت، میرے غضب پر غالب ہے“۔
خطیب ابوبکر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ایک انصاری شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتا تھا وہ حدیث غور سے سنتا تھا اور وہ اسے پسند کرتا تھا اور اسے یاد نہیں کرسکتا تھا اس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکایت کی عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ سے حدیث سنتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگتی ہے لیکن میں یاد نہیں کرسکتا۔ اسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنے دائیں ہاتھ سے مدد طلب کرو“ (1) اور آپ نے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا۔ یہ نص ہے اور علم کے لکھنے اور اس کی تدوین کے جواز پر جمہور صحابہ اور تابعین کا جواز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوشاہ کے لیے وہ خطبہ لکھنے کا حکم دیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقعہ پر دیا تھا۔ ابوشاہ یمن کا ایک شخص تھا اس نے وہ خطبہ لکھ کر دینے کا سوال کیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے تخریج کیا ہے۔ عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ”علم کو لکھنے کے ساتھ قید کرو“ (2)۔ معاویہ بن قرہ نے کہا: جو علم لکھتا نہیں اس کا علم، علم شمار نہیں ہوتا۔
بعض علماء علم کو لکھنے سے منع کرتے ہیں۔ ابونضرہ نے روایت کیا ہے فرمایا: ابوسعید سے پوچھا گیا: کیا ہم تمہاری یہ حدیث لکھیں۔ اس نے کہا: اس کو قرآن نہ بناؤ، لیکن یاد کرو جس طرح ہم نے یاد کیا ہے۔ اور جو نہیں لکھتے تھے ان میں شعبی، یونس بن عبید اور خالد حذاء ہیں۔ خالد نے کہا: میں نے کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی سوائے ایک حدیث کے جب وہ میں نے یاد کر لی تو وہ

1۔ ترمذی، باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ، حدیث نمبر 2590، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ خطیب تقیید العلم، صفحہ 109

میں نے مٹا دی۔ ان علماء میں ابن عون اور زہری بھی ہیں۔ بعض لکھتے تھے جب یاد کر لیتے تھے تو اسے مٹا دیتے تھے ان میں سے محمد بن سیرین اور عاصم بن ضمرہ ہیں۔ ہشام بن حسان نے کہا: میں نے کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی سوائے حدیث الاعماق کے جب میں نے وہ یاد کر لی تو میں نے اسے مٹا دیا۔

میں کہتا ہوں: ہم نے خالد حذاء سے اس کی مثل ذکر کیا ہے۔ حدیثِ اعماق کو مسلم نے کتاب کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ ''قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ رومی اعماق یا دابق میں اتریں گے''۔ اس کو کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے۔ بعض علماء پہلے حدیث یاد کرتے تھے پھر اسے لکھتے تھے ان میں اعمش، عبداللہ بن ادریس اور ہشیم وغیرہم ہیں۔ یہ حفظ پر احتیاط ہے۔ بہرحال لکھنا بہتر ہے۔ اس کے متعلق آیات اور احادیث وارد ہیں اور یہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور بڑے بڑے تابعین سے مروی ہے جیسے حسن، عطا، طاؤس، عروہ بن زبیر اور ان کے بعد والے اہل علم سے بھی یہ مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (الاعراف:145) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (الانبیاء) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً (الاعراف:156) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ (القمر) اور فرمایا: عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ان کے علاوہ بھی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ نیز علم کتابت کے ذریعے محفوظ ہوتا ہے، پھر مقابلہ، تکرار، تحفظ، تعہد، مذاکرہ، سوال، ناقلین سے جستجو کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جن علماء نے ابتدائی دور میں لکھنے کو ناپسند کیا تھا وہ عہد کے قرب کی وجہ سے تھا اور اسناد کے قرب کی وجہ سے تھا تاکہ کاتب لکھنے پر اعتماد نہ کرے اور سلسلہ سند اور حفظ اور عمل کو چھوڑ دے اب جبکہ زمانہ بہت دور ہو گیا ہے اسناد غیر متقارب ہیں، طرق مختلف ہو گئے ہیں، نقل کرنے والے متشابہ ہو گئے ہیں، نسیان کی آفت لاحق ہو چکی ہے، وہم سے بھی امن نہیں ہے پس لکھنے کے ساتھ علم کو مقید کرنا اولیٰ اور بہتر ہے اور اس کے وجوب پر دلیل زیادہ قوی ہے۔ اگر کوئی حضرت ابو سعید کی حدیث سے حجت پکڑے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے نہ لکھو، جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے'' (1)۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متقدم ہے اور کتابت کے امر کے ساتھ منسوخ ہے۔ ابو شاہ کے لیے لکھنے کی اباحت کے ساتھ منسوخ ہے نیز یہ اس لیے فرمایا تھا تاکہ قرآن کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہ مل جائے جو قرآن سے نہ ہو۔ اسی طرح حضرت ابو سعید سے بھی مروی ہے: ہم نے خواہش کی کہ نبی کریم ﷺ ہمیں لکھنے کی اجازت دیں تو آپ نے انکار کر دیا، اگر یہ محفوظ ہے تو یہ ہجرت سے پہلے کی ہے جب کہ قرآن کو چھوڑ کر حدیث سے مشغول ہونے کا اندیشہ تھا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابو بکر خطیب نے کہا: مناسب ہے کہ حدیث کالی سیاہی سے لکھی جائے پھر حبر (روشائی) خاص ہے مداد (سیاہی) نہیں کیونکہ سواد شوخ رنگ ہے اور حبر اسے کافی زمانہ باقی رکھتی ہے۔ سیاہی صاحب علم لوگوں کا آلہ ہے اور اہل

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 11158، 11085

معرفت کا ہتھیار ہے۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے ذکر کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا کہ مجھے امام شافعی نے دیکھا کہ میں ان کی مجلس میں تھا اور میری قمیص پر سیاہی لگی ہوئی تھی اور میں اسے چھپا رہا تھا۔ امام شافعی نے فرمایا: تو اسے کیوں چھپا رہا ہے؟ کپڑے پر سیاہی مروءت سے ہے کیونکہ اس کی صورت آنکھوں میں سیاہی ہے اور بصائر میں سفیدی ہے۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا: صاحب حدیث کے کپڑے میں سیاہی اس طرح ہے جیسے دلہن کے لباس پر خوشبو ہوتی ہے۔ ابوعبداللہ بلوی نے یہی مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

مِدادُ المَحابر طِیبُ الرجال　وطِیب النساء من الزّعفرانْ

فهذا یَلیق بأثواب ذا　و هذا یلیقُ بثوب الحَصَانْ(1)

ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن سلیمان جیسا کہ حکایت کیا گیا ہے نے اپنے کپڑوں پر زردی کا اثر دیکھا اس نے دوات سے کچھ سیاہی لی اور اس پر اسے مل دیا پھر فرمایا: ہمارے لیے سیاہ زعفران سے زیادہ خوبصورت ہے؛ اور شعر کہا:

إنّما الزّعفرانُ عِطرُ العَذارَی　ومِدادُ الدّوِیّ عِطرُ الرِّجالِ

مسئلہ نمبر 4۔ لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی ۞ اس کے مفہوم میں علماء کے پانچ اقوال ہیں:

(۱) یہ نیا کلام ہے اور ان دونوں صفتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کی گئی ہے اور کلام فِیۡ کِتٰبٍ میں مکمل ہو چکی ہے؛ اسی طرح زجاج نے کہا ہے۔ اور لَا یَضِلُّ کا معنی ہے وہ ہلاک نہیں ہوتا یہ اس قول سے ہے، ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ (السجدۃ: 10) کیا جب ہم زمین میں ہلاک ہو جائیں گے۔ وَ لَا یَنۡسَی ۞ وہ کوئی چیز بھولتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہلاکت اور نسیان سے تنزیہ بیان کی گئی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لَا یَضِلُّ کا معنی ہے وہ خطا نہیں کرتا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یعنی وہ تدبیر میں خطا نہیں کرتا جس کو اس نے مہلت دی وہ بھی اس نے کسی حکمت کے تحت مہلت دی اور جس کو جلدی پکڑ لیا تو یہ بھی اس کی حکمت کا تقاضا تھا۔ تیسرا قول یہ ہے لَا یَضِلُّ وہ غائب نہیں ہوتا؛ ابن الاعرابی نے کہا: الضلال کی اصل الغیبوبۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: ضلّ الناسی جب کسی سے کسی چیز کا یاد کرنا غائب ہو جائے۔ فرمایا: اس جملہ کا معنی ہے میرے رب سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی چیز سے غائب ہوتا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے یہ بھی زجاج نے کہا اور نحاس نے کہا: یہ معنی میں اس کے مشابہ ہے، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ کتاب کا محتاج نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا علم اور معرفت اس سے غائب نہیں ہوتی اور جو وہ علم رکھتا ہے اسے بھولتا نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ قول ابن الاعرابی کے قول کے مفہوم کی طرف راجع ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی ۞ کتاب کی صفت ہے یعنی وہ کتاب اللہ تعالیٰ سے غائب نہیں ہونے والی۔ وَ لَا یَنۡسَی یعنی وہ بھولنے والا نہیں۔ یہ دونوں کتاب کی صفت ہیں۔ اس بنا پر کلام متصل ہوگی اور کتاب پر وقف نہ ہوگا۔ عرب کہتے ہیں: ضلّنی الشیٔ جب کوئی چیز نہ پائے۔ أضللته أنا جب میں ایسی جگہ کسی چیز کو چھوڑ دوں کہ پھر میں اسے نہ پاؤں۔ حسن، قتادہ، عیسیٰ بن عمر، ابن محیصن، عاصم

1۔ الخطیب، فی الجامع لاخلاق الراوی، جلد 1، صفحہ 386

جحدری اور ابن کثیر نے جو شبل نے اس سے روایت کیا ہے۔ لایضل، یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا رب نہ اسے ضائع کرے گا اور نہ اسے بھولے گا۔ ابن عرفہ نے کہا: عربوں کے نزدیک الضلالہ کا معنی ٹیڑھے راستہ پر چلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضل عن الطریق وأضل الشئ جب کسی چیز کو ضائع کر دے اسی سے ہے جنہوں نے لایُضل ربی پڑھا ہے جس کا معنی ہے وہ ضائع نہیں کرے گا؛ یہ عربوں کا مذہب ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝۵۳ كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۝۵۴ؑ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵

”وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور بنادیے تمہارے فائدے کے لیے اس میں راستے اور اُتارا آسمان سے پانی، پھر ہم نے نکالے پانی کے ذریعے (شکم زمین سے) جوڑے گوناں گوں نباتات کے۔ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ، بیشک اس میں (ہماری قدرت وحکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لیے۔ اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور (روز حشر) اسی سے ہم تمہیں نکالیں گے ایک بار پھر“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا، الَّذِیْ، ربی کی نعت کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یعنی لایضل ربی الذی جعل، اور یہ بھی جائز ہے کہ الَّذِیْ مبتدا محذوف کی خبر ہو یعنی ھو الذی اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اعنی کے اضمار کے ساتھ منصوب ہو کوفیوں نے یہاں اور سورۃ الزخرف میں مَهْدًا میم کے فتحہ اور ھاء کے اسکان کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مھادا پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ (النباء) کی قرأت پر قراء کا اتفاق ہے۔ نحاس نے کہا: جمع اولیٰ ہے کیونکہ مھد مصدر ہے اور یہ مصدر کی جگہ نہیں بنتی مگر حذف کی تقدیر پر، یعنی ذات مھد۔ مہدوی نے کہا: جس نے مھدا پڑھا ہے جائز ہے۔ کہ یہ مصدر ہو جیسے الفرش یعنی مھد لکم الأرض مھدا اور یہ بھی جائز ہے کہ مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہو یعنی ذات مھد اور جنہوں نے مھادا پڑھا ہے جائز ہے کہ الفرش کی طرح مفرد ہو اور جائز ہے کہ یہ مھد کی جمع ہو اسماء کے استعمال کی طرح استعمال کیا گیا ہو اور پھر جمع مکسر بنائی گئی ہو اور مھاداً کا معنی فراشا اور قرارا ہے جس پر وہ ٹھہرتے ہیں۔ وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا یعنی طرقا اس کی مثال یہ آیت ہے، وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ (نوح)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (الزخرف)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا آخر ہے۔ پھر فرمایا: فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ بعض نے فرمایا: یہ تمام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے ہے۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ کا مطلب ہے ہم نے کھیتی باڑی اور محنت کے ذریعے نکالا، کیونکہ آسمان سے نازل ہونے والا پانی نباتات کے خروج کا سبب ہے۔ اَزْوَاجًا

کا معنی اقسام ہے، یعنی مختلف قسموں اور رنگوں میں کئی نباتات نکالیں۔ اخفش نے کہا: تقدیر یہ ہے ازواجاً شتی من نبات، فرمایا: کبھی نباتات کی نعت بنانا بھی جائز ہے اور شتی یہ شت الشئی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے جدا جدا ہونا۔ کہا جاتا ہے: أمرشت متفرق امر، شت الأمرشتا وشتاتا متفرق ہونا۔ اشتتّ کا بھی یہی معنی ہے اسی طرح التشتت ہے، شتته، تشتیتا اس نے اس کو متفرق کر دیا۔ أشت بی قومی یعنی میرے معاملہ کو متفرق کر دیا۔ الشتیت کا معنی ہے المتفرق۔ رؤبہ نے اونٹوں کا وصف بیان کیا ہے:

جَاءَتْ مَعًا وَاطْرَقَتْ شَتِيتًا ۝ هي تُثِيرُ السَّاطِعَ السِّخْتِيتَا

ثغرٌ شتیتٌ یعنی کھلا۔ قوم شتی وأشیاء شتی تو کہتا ہے: جاءوا اشتاتاً، وہ متفرق طور پر آئے۔ اس کا واحد ہے، یہ جوہری کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ امر اباحت کے لیے ہے۔ وَارْعَوْا یہ رعت الماشية الكلاء رعاها صاحبها رعاية سے مشتق ہے یعنی مالک نے جانور کو چرایا۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى، اولی النهی سے مراد عقلمند لوگ ہیں۔ اس کا واحد نهية ہے۔ ان کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنی رائے تک رو کے جاتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: کیونکہ وہ اپنے نفس کو قبائح سے روکتے ہیں۔ یہ تمام کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے خلاف حجت پیش کرنا ہے کہ صانع موجود ہے جبکہ فرعون نے کہا تھا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ اور بیان کیا کہ صانع پر اس کے افعال سے دلیل پکڑی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کیونکہ انہیں زمین سے پیدا کیا گیا تھا۔ ابو اسحاق زجاج وغیرہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: ہر نطفہ مٹی سے تیار کیا جاتا ہے اس پر قرآن کا ظاہر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اس پر اس کی قبر کی مٹی سے مٹی ڈالی جاتی ہے''۔ ابو نعیم الحافظ نے ابن سیرین کے باب میں روایت کی ہے اور فرمایا: یہ حدیث غریب ہے حدیث عون سے، ہم نے اس کو نہیں لکھا مگر ابو عاصم نبیل کی حدیث سے۔ یہ اہل بصرہ سے ثقہ اور عظیم لوگوں میں سے ہے۔ یہ مفہوم سورۃ الانعام میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے واضح طور پر گزر چکا ہے۔ عطا خراسانی نے کہا: جب رحم میں نطفہ واقع ہوتا ہے تو رحم پر متعین فرشتہ جاتا ہے اور اس مکان سے مٹی لیتا ہے جہاں اس نے دفن ہونا ہوتا ہے اور پھر اس نطفہ پر ڈالتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس نطفہ اور مٹی سے اس کو تخلیق فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ حضرت براء کی حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مومن کی روح جب نکلتی ہے تو ملائکہ اسے اوپر لے جاتے ہیں وہ فرشتوں کے جس گروہ سے اس کو گزارتے ہیں وہ کہتے ہیں: یہ کس کی پاکیزہ روح ہے؟ وہ فرشتے کہتے ہیں: فلاں بن فلاں، وہ اس کا خوبصورت نام لیتے ہیں جس کے ساتھ دنیا میں لوگ اسے پکارتے تھے۔ پس وہ اس کے لیے آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں تو دروازہ کھول دیا جاتا ہے پھر ہر آسمان سے مقربین فرشتے اسے اوپر والے آسمان تک الوداع کہتے ہیں حتیٰ کہ وہ فرشتے اسے ساتویں آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے علیین میں

کتاب لکھو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو میں نے انہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور اس میں میں انہیں لوٹاؤں گا اور دوبارہ انہیں اس سے نکالوں گا پھر اس کی روح اس کے جسم کی طرف لوٹا دی جاتی ہے"(1) اور حدیث ذکر کی۔ ہم نے یہ حدیث مکمل اپنی کتاب "التذکرہ" میں ذکر کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ یعنی موت کے بعد تمہیں لوٹائیں گے۔ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ بعث اور حساب کے لیے زمین سے تمہیں نکالیں گے۔ تَارَةً أُخْرَىٰ یہ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ کی طرف راجع ہے۔ نُعِيدُكُمْ کی طرف راجع نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: اشتریت ناقۃ ودارا وناقۃ اخریٰ مطلب یہ ہے کہ زمین سے ہم نے تمہیں نکالا اور موت کے بعد زمین سے ایک بار پھر نکالیں گے۔

وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٦﴾ قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٥٧﴾ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَىٰ ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ ﴿٦١﴾

"اور ہم نے دکھلا دیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا: موسیٰ! کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ نکال دو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جادو کی طاقت سے۔ سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں جادو ویسا ہی پس (اب) مقرر کر دو ہمارے اور اپنے درمیان مقابلے کا دن نہ ہم پھریں اس سے اور نہ ہی تو پھرے جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو۔ آپ نے فرمایا: (تمہارا چیلنج منظور ہے) جس کا دن تمہارے لیے مقرر کرتا ہوں اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں۔ پھر فرعون واپس مڑا اور اکٹھا کیا اپنے فریب کاروں کو پھر خود آیا۔ فرمایا ان فرعونیوں کو موسیٰ نے: کم بختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹا دے گا کسی عذاب سے اور (اس کا یہ اٹل قانون ہے) کہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے جو افترا بازی کرتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا یعنی وہ معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرتے تھے۔ بعض نے فرمایا: وہ آیات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی تھیں۔ فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٦﴾ یعنی ایمان نہ لایا۔ یہ دلیل ہے کہ اس نے عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کفر کیا کیونکہ اس نے آیات (معجزات) اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے نے سنائے نہ تھے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے، وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (النمل: 14)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٥٧﴾ وہ آیات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 18534

کرآئے اور اس نے انہیں دیکھا تو کہنے لگا: یہ جادو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اس لیے آیا ہے تا کہ لوگوں کو وہم میں ڈالے تو ایسی نشانی لے آیا جو تیری اتباع اور تجھ پر ایمان لانے کا موجب ہے تا کہ تو ہماری زمین پر اور ہم پر غالب آ جائے۔ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ ہم اس کی مثل کے ساتھ تیرا مقابلہ کریں گے جو تو لے کر آیا تا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ جو تو لے کر آیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا، مَوْعِدًا مصدر ہے یعنی وعداً۔ بعض نے فرمایا: الموعد وعدہ کی جگہ کا اسم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿﴾ (الحجر) پس الموعد سے یہاں مکان مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: وعدہ کے زمانہ کا اسم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ (ہود: 81) مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک دن متعین کرو یا مخصوص جگہ کا تعین کرو۔ قشیری نے کہا: اظہر یہ ہے کہ یہ مصدر ہے اسی وجہ سے فرمایا: لَّا نُخْلِفُهٗ یعنی ہم اس وعدہ سے نہیں پھریں گے۔ الاخلاف کا مطلب ہے کسی سے کام کا وعدہ کرنا اور پھر اسے پورا نہ کرنا۔ جوہری نے کہا: المیعاد کا مطلب الموعدۃ، الوقت اور الموضع ہے، اسی طرح الموعد ہے۔ ابو جعفر ابن قعقاع، شیبہ اور اعرج نے لانخلفه، اجعل جواب کی وجہ سے جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جنہوں نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے تو انہوں نے موعد کی صفت بنایا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: موعوداً غیر مخلف۔

مَكَانًا سُوًى ﴿﴾ ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے سُوًى سین کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے عُداً و عِداً طُوًى و طِوًى۔ ابو عبیدہ اور ابو حاتم نے سین کے کسرہ کے ساتھ اختیار کیا ہے کیونکہ یہ لغت عالیہ فصیحہ ہے۔ نحاس نے کہا: کسرہ زیادہ معروف و مشہور ہے۔ تمام نے واؤ کو تنوین دی ہے۔ حسن سے مروی ہے اور ان سے سین کے ضمہ اور بغیر تنوین کے پڑھنے میں اختلاف مروی ہے۔ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ مکان برابر ہو؛ یہ کلبی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: ایسا ہموار مکان جس میں وہ سب کچھ واضح نظر آئے جو ہم بیان کریں، یہ ابن زید کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی نصف بیان کیا ہے۔ مجاہد نے منصف بیان کیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ سے اس کا معنی عدلاً بيننا وبينك بھی مروی ہے۔ نحاس نے کہا: اہل تفسیر نے سوی کا معنی نصف اور عدل بیان کیا ہے؛ یہ حسن قول ہے۔ سیبویہ نے کہا: کہا جاتا ہے: سِوی و سُوی، یعنی عدل (مساوی) یعنی اسی جگہ جو دونوں اطراف کا نصف بنتی ہو۔ اس کی اصل تیرے اس قول سے ہے: جلس فی سواء الدار، وہ گھر کے وسط میں بیٹھا۔ اور ہر چیز کا وسط اس کا نصف ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ: 143) کی تفسیر میں عدلاً مروی ہے (1)۔ زہیر نے کہا:

أرُونا خُطّةً لاضَيْمَ فِيها　يُسَوِّى بيننا فيها السَّوَاءُ

ابو عبیدہ اور قتبی نے کہا: دونوں فریقوں کے درمیان کی جگہ۔ ابو عبیدہ نے موسیٰ بن جابر حنفی کے لیے یہ شعر کہا:

وانّ أبانا كان حلّ ببلدة　سِوًى بين قيس قيس عَيْلَان والفِزْرِ

الفزر سے مراد سعد بن زید مناۃ بن تمیم ہے۔ اخفش نے کہا: سوی جب بمعنی غیر یا بمعنی عدل ہو تو اس میں تین لغات

1۔ ترمذی، باب ومن سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2886

ہوتی ہیں۔ اگر سین کو ضمہ دیا جائے یا کسرہ دیا جائے تو دونوں صورتوں میں قصر کے ساتھ ہوگا اگر سین کو فتحہ دیا جائے تو مد کے ساتھ پڑھا جائے گا تو کہتا ہے: مکان سوی و سوی و سواء یعنی دونوں فریقوں کی درمیانی جگہ۔ موسیٰ بن جابر نے کہا:

وجدنا أبانا كان حلّ ببلدة

بعض نے فرمایا: مكاناً سُوى سے مراد ہموار جگہ ہے۔ اس قول والے نے یہ شعر پڑھا ہے:

لو تَمَنَّتْ حَبِيبَتِي مَاعَدَتْنِي وتَمَنَّيْتُ مَاعَدوتُ سِواها

اور تو کہتا ہے: مررت برجل سواك وسُواك وسوائك یعنی غیرك (تیرے سوا) دونوں اس امر میں برابر ہیں۔ اگر تو چاہے تو سواء ان کہے اور جمع کے لیے سواء اور هم اسواء وهم سواسة جیسے ثمانية بغیر قیاس کے آتا ہے۔ مَكَانًا پر نصب جعل کے مفعول ثانی کی وجہ سے ہے۔ موعد کی وجہ سے اس کو نصب دینا درست نہیں کیونکہ وہ مفعول ہے یا ظرف ہے کیونکہ الموعد سے وصف بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ اسماء جو افعال کے عمل کی طرح عمل کرتے ہیں جب ان کا وصف ذکر کیا جائے یا تصغیر بنائی جائے تو ان کا عمل کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ شبہ فعل سے نکل گئے ہیں اور اس کو اس پر محمول کرنا بہتر نہیں کہ ظرف مفعول ثانی کی جگہ واقع ہوئی ہے، کیونکہ موعد کے بعد جب ظرف واقع ہو تو عرب ظروف کے ساتھ مصادر کے قائم مقام نہیں کرتے بلکہ وہ اس میں وسعت کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ (ہود: 81) مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ۔ یوم الزينة کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ عید کا دن تھا اس میں وہ زینت اختیار کرتے تھے اور جمع ہوتے تھے؛ یہ قتادہ اور سدی وغیرہما کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعد بن جبیر نے فرمایا: یہ عاشوراء کا دن تھا۔ سعید بن مسیب نے کہا: بازار کا دن مراد ہے جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے؛ یہ بھی قتادہ کا قول ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ ہفتہ کا دن ہے۔ بعض نے کہا: نیروز کا دن ہے؛ یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ وہ دن ہے جس میں خلیج ٹوٹتی تھی یہ اس لیے کہ اس میں وہ باہر نکلتے تھے اور سیر و سیاحت کرتے تھے۔ اس وقت نیل کی طرف سے مصر کے شہر امن میں ہوتے تھے۔ حسن، اعمش، عیسیٰ ثقفی، سلمی اور ہبیرہ نے حفص سے یومَ الزينة پڑھنا روایت کیا ہے۔ یوم الزينة نصب کے ساتھ ہے۔ ابو عمرو سے روایت کیا گیا ہے کہ زینت کے دن میں ہمارے وعدہ کو پورا ہونا ہے۔ باقی قراء نے مبتدا کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى یعنی لوگوں کا جمع ہونا چاشت کے وقت ہوگا۔ اَنْ، ان لوگوں کی قرات پر محل رفع ہوگا جنہوں نے یوم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَنْ يُّحْشَرَ کا عطف رفع کی قرات کو تقویت دیتا ہے، کیونکہ اَن ظرف نہیں ہوتا اگرچہ مصدر صریح ظرف ہوتا ہے، جیسے مقدم الحاج کیونکہ جنہوں نے کہا: آتيك مقدم الحاج اس نے آتيك أن يقدم الحاج نہیں کہا۔ نحاس نے کہا: اس سے بہتر یہ ہے کہ الزينة پر عطف کی بناء پر محل جر میں ہو۔ الضحى مؤنث ہے عرب بغیر ھا کے اس کی تصغیر کرتے ہیں تاکہ اس کی تصغیر ضحوة کی تصغیر کے مشابہ نہ ہو جائے؛ یہ نحاس کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ضحوة النهار، سورج کے طلوع ہونے کے بعد کا وقت ہے پھر اس کے بعد الضحا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب سورج چمکتا ہے۔ اور جنہوں نے اس کو مؤنث بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ ضحوة مقصود ہے مؤنث اور مذکر استعمال ہوتا ہے۔

کی جمع ہے اور جنہوں نے اسے مذکر بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ فُعَلٌ کے وزن پر اسم ہے جیسے صُرَدٌ اور نُغَرٌ یہ سحر کی طرح ظرف غیر متمکن اسم ہے۔ تو کہتا ہے: لقیتہ ضحاً وضُحا۔ تو ضحا سے مراد پورا دن لے گا تو اس کو مؤنث نہیں بنائے گا۔ پھر اس کے بعد الضحاء کو ممدود مذکر ذکر کیا ہے۔ اور یہ سورج کا اچھی طرح بلند ہونے کا وقت ہے۔ الضحاء کو خاص کیا ہے کیونکہ یہ دن کا آغاز ہوگا۔ اگر معاملہ ان کے درمیان ہو تو دن میں وسعت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور جحدری وغیرہما سے مروی ہے: وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا۔ بعض قراء سے مروی ہے: وان تحشر الناس، اس کا معنی ہوگا اے فرعون! تو لوگوں کو جمع کرے گا۔ جحدری سے مروی ہے: وان نحشر نون کے ساتھ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اس دن کا وعدہ کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور اس کے دین کا ظہور ہو اور کافر نامراد ہو اور اس پر عام باطل بھاگ جائے۔ اور پھر مجمع میں باطل کی رسوائی ہو تا کہ حق میں رغبت کرنے والے کی رغبت میں تقویت ہو اور باطل گروہ عاجز آجائے اور اس امر کو ہر دیہات اور شہروں میں بیان کرنے والے زیادہ ہوں اور تمام لوگوں میں حق پھیل جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ، کید سے مراد حیلہ اور جادو ہے مراد جادوگروں کو جمع کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بہتر جادوگر تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ رسیاں اور لاٹھیاں تھیں۔ بعض نے کہا: وہ چار سو تھے۔ بعض نے کہا: وہ بارہ ہزار تھے۔ بعض نے کہا: وہ چودہ ہزار تھے۔ ابن المنکدر نے کہا: وہ اسی ہزار تھے۔ بعض نے کہا: وہ ایک رئیس کے ماتحت تھے جس کو شمعون کہا جاتا تھا۔ بعض نے کہا: اس کا نام یوحنا تھا اس کے ساتھ بارہ نقیب تھے ہر نقیب کے ساتھ بیس عریف (رہبر) تھے اور ہر عریف کے ساتھ ہزار جادوگر تھے۔ بعض نے کہا: وہ تین لاکھ جادوگر فیوم سے تھے تین لاکھ صعید سے تھے اور تین لاکھ ریف سے تھے وہ کل نو لاکھ تھے اور ان کا رئیس اندھا تھا۔ ثُمَّ اَتٰى ۝ یعنی وقت مقررہ پر آیا۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور جادوگروں سے کہا: وَيْلَكُمْ یہ ان پر ہلاکت کی بددعا ہے۔ یہ بمعنی مصدر ہے ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ منصوب ہے بمعنی الزمهم الله ويلا اللہ ان پر ہلاکت کو لازم کرے۔ فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ندا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا (یٰسین: 52)

لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا یعنی تم اس پر جھوٹ مت گھڑو اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اور معجزات کو جادو نہ کہو۔ فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ورنہ وہ تمہیں ہلاک کر کے نیست و نابود کر دے گا۔ کہا جاتا ہے: سحت، أسحت دونوں کا معنی ایک ہے اس کی اصل بالوں کو مونڈ دینا ہے۔ کوفیوں نے فیسحتکم، أسحت سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے سحت سے مشتق کر کے فیسحتکم پڑھا ہے۔ یہ اہل حجاز کی لغت ہے اور پہلی بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور نصب نہی کے جواب کی بنا پر ہے۔

فرزدق نے کہا:

عَضُّ زمانٍ يابنَ مَرْوانَ لم يَدَعْ　　من المالِ إلّا مُسْحَتًا او مُجَلَّفُ

زمخشری نے کہا: یہ وہ بیت ہے ہمیشہ قافلہ علماء اس کے اعراب کے درست کرنے میں گھٹنے رگڑتا رہا۔

وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا ہے جس کی اس نے اجازت

نہیں دی وہ رحمت اور ثواب سے خسارے میں ہے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

''پس وہ جھگڑنے لگے اس کام کے متعلق آپس میں اور چھپ چھپ کر مشورے کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے: بلاشبہ یہ دو جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ نکال دیں تمہیں تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹادیں تمہاری (تہذیب وثقافت کے) مثالی طریقوں کو۔ پس یکجا کرلو اپنی حیلہ سازیوں کو پھر آؤ پرے باندھے ہوئے اور کامیاب ہوگا آج وہ گروہ جو (اس مقابلہ میں) غالب رہا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ یعنی جادوگروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ چھپ چھپ کر مشورہ کرنے لگے۔ قَالُوْٓا انہوں نے کہا: اگر وہ جو لے کر آئے ہیں جادو ہوگا تو ہم غالب آجائیں گے اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام ہوگا تو اس کا امر غالب آجائے گا یہ انہوں نے سرگوشی کی تھی۔ بعض نے کہا: انہوں نے یہ سرگوشی کی تھی اگر وہ ہم پر غالب آگیا تو ہم اس کی اتباع کریں گے، یہ کلبی کا قول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نیکوکاروں کا معاملہ ہی بالآخر غالب آتا ہے۔ بعض نے کہا: ان کا سرگوشی کرنا یہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا تو انہوں نے کہا: یہ جادوگر کا قول نہیں ہے۔ النجویٰ سرگوشی کرنا یہ اسم اور مصدر ہوتا ہے۔ سورۃ النساء میں اس کا بیان آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ ابو عمرو نے ان هذين لساحران پڑھا ہے۔ حضرت عثمان، حضرت عائشہ وغیرہما رضی اللہ عنہم صحابہ سے یہ مروی ہے۔ اسی طرح حسن، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی وغیرہم نے بھی پڑھا ہے۔ قراء میں سے عیسیٰ بن عمر، عاصم جحدری نے اسی طرح پڑھا ہے جیسا کہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ یہ قرأت اعراب کے موافق ہے اور مصحف کے مخالف ہے۔ زہری، خلیل بن احمد، مفضل، ابان، ابن محیصن، ابن کثیر اور عاصم نے ایک روایت میں پڑھا ہے: حفص نے بھی ان هذان ان کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر هذان کی نون کو شد سے پڑھتے تھے۔ یہ قرأت مصحف کی مخالفت سے سلامت ہے اور اعراب کے فساد سے سلامت ہے۔ اس کا معنی ہے ماهذان إلا ساحران۔ مدنی اور کوفی قراء نے انّ هذان، انّ کو شد کے ساتھ اور لساحران پڑھا ہے۔ انہوں نے مصحف کی موافقت کی اور اعراب کی مخالفت کی۔ نحاس نے کہا: یہ تین قرأتیں ہیں۔ ائمہ کی ایک جماعت نے ان کو روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے انْ هذان إلا ساحران پڑھا ہے۔ کسائی نے حضرت عبداللہ کی قرأت میں ان هذان ساحران بغیر لام کے کہا ہے۔ فراء نے حضرت ابی کی قرأت میں اِن ذان إلا ساحران کہا ہے۔ یہ مزید تین قرأتیں ہیں۔ یہ تفسیر پر محمول ہوں گی ان کے ساتھ قرآن کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: اہل مدینہ اور کوفہ کی قرأت میں، مہدوی نے اپنی تفسیر میں اور ان کے علاوہ علماء نے ان کے کلام کے بعض کو بعض میں داخل کردیا اور ایک قوم نے اس میں خطا کی حتیٰ کہ ابو عمر نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا ہوں کہ میں ان هذان

پڑھوں، عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ان سے لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (النساء:162) کے متعلق پوچھا گیا پھر المقیمین اور سورہ مائدہ میں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ (المائدہ:69) کے متعلق پوچھا اور اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ کے متعلق پوچھا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے میرے بھانجے! یہ کاتب کی خطا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا: مصحف میں غلطی ہے۔ عرب اپنی زبان کے ساتھ اس کو ٹھیک کرلیں گے☆۔ حضرت ابان ابن عثمان نے کہا: میں نے یہ آیت اپنے باپ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے سامنے تلاوت کی تو انہوں نے فرمایا یہ لحن اور خطا ہے۔ کسی نے ان سے کہا: کیا تم لوگ اسے تبدیل نہیں کرو گے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کو چھوڑو کیونکہ یہ نہ حلال کو حرام کرتا ہے اور نہ حرام کو حلال کرتا ہے۔ پہلا قول چھ اقوال میں سے ہے یہ بنی حرب بن کعب، زبیر بن خثعم کی لغت ہے اور کنانہ بن زید تثنیہ کا رفع، نصب اور حرف الف کے ساتھ پڑھتے ہیں کہتے ہیں۔ جاء الزیدان، رأیت الزیدان، مررت بالزیدان، اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ (یونس:16) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے بنی اسد کے ایک شخص کا شعر پڑھا اور کہا: میں نے اس سے افصح نہیں دیکھا:

فأطرقَ إطراقَ الشُّجاعِ لو يرىٰ مَساغاً لِنابَاهُ الشُّجاعُ لَصَمَّما

اور وہ کہتے ہیں: کسرت یداہ و رکبت علاہ بمعنی یدیہ و علیہ، ان کے شاعر نے کہا:

تَزَوَّدَ مِنا بين أُذْنَاه ضَرْبَةً دعته إلى هابِي التُّرابِ عقيم

محل استدلال "بین اذناہ" ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

إنَّ أَبَاهَا وَأَبَا أَباهَا قد بَلَغَا فى المجدِ غايتاها

یعنی ان اباا بیہا وغایتیہا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ قول ان تمام اقوال سے عمدہ ہے جن پر آیت کو محمول کیا گیا ہے جب کہ یہ لغت معروف ہے اس کو اس نے حکایت کیا ہے جن کے علم اور امانت کو پسند کیا گیا ہے۔ ان میں سے ابو زید انصاری ہے وہ کہتا ہے: جب سیبویہ کہے: حدثنی من أثق بہ تو اس سے مراد میری ذات ہوتی ہے۔ ابو الخطاب اخفش یہ لغت کے ائمہ کا سردار ہے، کسائی اور فراء تمام کہتے ہیں کہ یہ بنی حرث بن کعب کی لغت ہے۔ ابو عبیدہ نے ابو الخطاب سے حکایت کیا ہے کہ یہ بنی کنانہ کی لغت ہے۔ مہدوی نے کہا: ان کے علاوہ نے حکایت کیا ہے کہ یہ خثعم قبیلہ کی لغت ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جو کچھ سیبویہ کے قول میں کہا گیا اس میں سے واضح ہے جان لے کہ جب تو واحد کا تثنیہ بنائے گا تو تو اس پر دو چیزیں زائد کرے گا ایک یہ کہ حرف مد اور لین اور وہ اعراب کا حرف ہے۔ ابو جعفر نے کہا: سیبویہ کا قول کہ وہ اعراب کا حرف ہے یہ ثابت کرتا ہے کہ اصل تبدیل نہیں ہوتی۔ پس ان ھذان اپنی اصل پر آیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ (المجادلہ:19) استحاذ نہیں فرمایا یہ اس طرح اس لیے آیا ہے تاکہ اصل پر دلالت کرے اسی

☆ اس قسم کے اقوال کا جلیل القدر صحابہ کرام کی طرف منسوب ہونا محل نظر ہے جن جلیل القدر صحابہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ لغت میں مہارت تامہ رکھتے تھے حضرت مفسر نے کئی مقامات پر اس پر گفتگو کی ہے اور ایسی روایات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا امام قشیری نے فرمایا ایسا مسلک اپنانا باطل ہے۔

طرح ان ھذان جو اس لغت کا انکار کرے اس کے انکار میں غور نہیں کیا جائے گا کیونکہ آئمہ نحو نے اس کو روایت کیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں انّ بمعنی نعم (ہاں) ہے جیسا کہ کسائی نے عاصم سے روایت کیا ہے، فرمایا: عرب انّ بمعنی نعم ذکر کرتے ہیں۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ انّ بمعنی اجل بھی آتا ہے۔ اس قول کا نظریہ محمد بن یزید اور اسماعیل بن اسحاق قاضی کا ہے۔ نحاس نے کہا میں نے ابو اسحاق زجاج اور علی بن سلیمان کو یہ قول کرتے ہوئے سنا۔ ابو اسحاق نحاس نے اس پر تعجب کیا۔ علی بن سلیمان نے ہمیں بیان کیا اور انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن احمد بن عبدالسلام نیشاپوری نے ہمیں بیان کیا پھر میں عبداللہ بن احمد سے ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے عمیر بن متوکل نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن موسیٰ نوفلی نے بتایا جو حرث بن عبداللہ کی اولاد سے تھے فرمایا ہمیں عمر بن جمی کوفی نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے علی سے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے باپ حضرت علی سے روایت کیا ہے فرمایا: میں شمار ہی نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ منبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: إن الحمدُ للّٰه نحمدہٗ ونستعینہٗ پھر فرماتے: میں تمام قریش سے زیادہ فصیح ہوں اور میرے بعد ابان بن سعید بن عاص افصح ہوگا۔ ابو محمد خفاف نے کہا: عمیر نے کہا اس کا اعراب اہل لغت کے نزدیک إن الحمد للّٰہ نصب کے ساتھ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ کیا نعم الحمد للّٰہ۔ یہ اس طرح ہے کہ عرب اپنے خطبات نعم کے معنی استعمال کر کے آغاز کرتے تھے۔ شاعر نے نعم کے معنی میں اس کو استعمال کیا ہے:

قالوا غَدَرْتَ فقلتُ إنّ و رُبّما　　نَالَ العُلا وَشَفَى الغَلِيلَ الغادِرُ

محل استدلال انّ و ربما ہے۔ عبداللہ بن قیس نے کہا:

بَكَرَ العواذِلُ في الصِّبا　ح يَلُمْنَنِي　و أَلُومُهُنَّهْ

ويَقُلْنَ شَيْبٌ قد عَلَا　كَ وقد كَبِرْتَ فقلتُ إنَّهْ

محل استدلال ''انه'' ہے۔ اس بناء پر إِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ میں انّ بمعنی نعم جائز ہے۔ اور اس پر نصب نہیں دی۔ نحاس نے کہا: داؤد بن ہشیم نے شعر پڑھا اور ثعلب نے مجھے یہ شعر سنایا:

ليت شعري هل للمحبّ شفاء　　من جَوَى حبهن إنّ اللقاءُ

محل استدلال ''ان اللقاء'' ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قول عمدہ ہے مگر اس میں کچھ کمزوری ہے کیونکہ کہا جاتا ہے: نعم زید خارج یہاں اللام واقع نہیں ہوتا اگرچہ نحویوں نے اس کے بارے کلام کی ہے اور انہوں نے کہا: اللام سے تقدیم کی نیت کی گئی ہے، جیسے کہا جاتا ہے:

خالِي لأنتَ ومَنْ جريرٌ خاله　　يَنَلِ العَلاءَ ويَكْرِمِ الأخوالا

ایک اور شاعر نے کہا:

أُمُّ الحُلَيْسِ لَعَجُوزٌ شَهْرَبَهْ　　تَرْضَى من الشَّاةِ بِعَظْمِ الرَّقَبَهْ

یعنی لغانی ولام الحلیس؛ زجاج نے کہا: مطلب یہ ہے کہ آیت میں معنی یہ ہے إن هذان لهما ساحران پھر مبتدا کو حذف کیا گیا۔ مہدوی نے کہا: ابو علی اور ابو الفتح جنی نے اس کا انکار کیا ہے۔ ابو الفتح نے کہا: هما حذف نہیں کیا جاتا مگر معروف ہونے کے بعد۔ جب معروف ہو تو اس کی معرفت کی وجہ سے لام کے ساتھ تاکید ذکر نہیں کی جاتی اور یہ قبیح ہے کہ موکد کو حذف کیا جائے اور موکد کو باقی رکھا جائے۔

تیسرا قول بھی فراء کا ہے کہتے ہیں: الف ستون ہے فعل کا لام کلمہ نہیں ہے میں نے اس پر نون زیادہ کیا ہے اور میں نے اس پر تبدیلی نہیں کی جیسے تو کہتا ہے: الذی پھر تو اس پر نون زیادہ کرتا ہے اور تو کہتا ہے: جاءنی الذین عندك و رأیت الذین عندك و مررت بالذین عندك۔

چوتھا قول یہ ہے جو بعض کوفیوں نے کہا ہے انہوں نے کہا: هذان میں الف یفعلان میں الف کے مشابہ ہے پس تبدیل نہیں ہوا۔

پانچواں قول ابو اسحاق کا ہے انہوں نے کہا: قدماء نحوی کہتے ہیں یہاں هاء مضمرہ ہے معنی یہ ہے انه هذان لساحران۔ ابن انباری نے کہا: هاء مضمرہ ہے جو منصوب ہے اور هذان، ان کی خبر ہے اور ساحران کو رفع هما مضمر کی وجہ سے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے انه هذان لهما ساحران۔ اس جواب والوں کے نزدیک اثبت یہ ہے کہ هاء ان کا اسم ہو اور هذان مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔

چھٹا قول یہ ہے ابو جعفر نحاس نے کہا: میں نے ابو الحسن بن کیسان سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا اگر تو چاہے تو میں تجھے نحویوں کے جواب کے ساتھ جواب دوں اگر تو چاہے تو میں تجھے اپنے قول کے ساتھ جواب دوں۔ میں نے کہا: اپنے قول کے ساتھ جواب دو، انہوں نے کہا: اسماعیل بن اسحاق نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا: میرے نزدیک قول یہ ہے کہ جب کہا جاتا ہے: هذا محل رفع، نصب اور جر میں ایک حالت پر ہوتا ہے اور تثنیہ میں واجب ہے کہ اس کا واحد تبدیل نہ ہو تثنیہ واحد کے قائم مقام ہو اور فرمایا: کیا اچھا ہوتا کہ تجھے پہلے کسی نے یہ قول کیا ہوتا تاکہ اس سے مانوس ہوا جاتا۔ ابن کیسان نے کہا: میں نے اسے کہا قاضی نے کہا ہے حتی کہ اس کو پسند کیا گیا ہے تو انہوں نے تبسم فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُرِيدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ یہ فرعون کے جادوگروں کو کہا یعنی ان دونوں حضرات کی غرض تمہارے اس دین کو خراب کرنا ہے جس پر تم ہو جیسا کہ فرعون نے کہا: اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ (غافر) کہا جاتا ہے: فلان حسن الطریقه یعنی فلاں عمدہ مذہب والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: طریقة القوم سے مراد افضل القول ہے۔ یہ وہ ہے کہ مناسب ہے کہ وہ اس کے طریقوں پر چلیں اور اس کی اقتدا کریں معنی یہ ہے کہ وہ تمہارے سرداروں اور تمہارے رؤسا کو مائل کرتے ہوئے لے جائیں یا معنی ہو کہ وہ بنی اسرائیل کو لے جائیں ان سے مراد اماثل ہیں اگرچہ وہ تمہارے نوکر تھے، کیونکہ ان کا شجرہ نسب انبیاء کی طرف لوٹتا تھا یا یہ معنی کہ وہ یذهبا باهل طریقتکم یعنی اہل مضاف محذوف ہے۔ المثلی یہ الامثل کی تانیث ہے، جیسے کہا جاتا

ہے: الافضل والفضلی، طریقة کو لفظ کی بنا پر مونث ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس سے مراد مرد ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ تانیث، جماعت کے معنی کی بنا پر ہو۔ کسائی نے کہا: بِطَرِيْقَتِكُمُ سے مراد تمہاری سنت اور تمہارا چال چلن ہے۔ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ لغت ہے جیسے تیرا قول ہے: امرأۃ کبرٰی، عرب کہتے ہیں: فلان علی الطریقة المثلی، یعنی وہ ہدایت مستقیم پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ الاجماع کا معنی کسی چیز کا پختہ عزم کرنا ہے تو کہتا ہے: أجمعت الخروج یعنی تو نے نکل جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ تمام علماء کی قرأت فأجمعوا ہے سوائے ابوعمرو کے انہوں نے فاجمعوا ہمزہ وصلی کے ساتھ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ سے حجت پکڑی ہے۔ نحاس نے کہا: میرے لیے محمد بن یزید سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: ابوعمرو پر واجب ہے کہ وہ اپنی اس قرأت کے خلاف پڑھیں اور وہ وہ قراءت ہے جس پر اکثر لوگوں کا اتفاق ہے۔ فرمایا: انہوں نے فجمع سے حجت پکڑی ہے یہ تو ثابت ہے پس اس کے بعد فاجمعوا ہونا بعید ہے۔ اور اس کے بعد اجمعوا ہونا قریب ہے، یعنی عزم کرو اور سنجیدگی اختیار کرو۔ جو کچھ پہلے گزر چکا ہے واجب ہے کہ یہ اس کے معنی کے خلاف ہو۔ کہا جاتا ہے: امر مجمع و مجمع علیه۔ اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: ابوعمرو کی قرات فاجمعوا صحیح ہے، یعنی اجمعوا کل کید لکم وکل حیلة فضموه مع أخیه۔ یہ قول ابواسحاق کا ہے۔ ثعلبی نے کہا: ہمزہ قطعی اور میم کے کسرہ کی قرأت کی دو وجہیں ہیں۔ (۱) بمعنی الجمع تو کہتا ہے: أجمعت الشئ وجمعته دونوں ہم معنی ہیں۔ صحاح میں ہے: أجمعت الشئ تو نے کسی چیز کو جمع کر دیا۔ ابوذویب اپنے گدھوں کی تعریف کرتا ہے:

فکأنها بالجِزْعِ بَیْنَ نُبَایِعٍ وأولاتِ ذی العَرْجاءِ نَهْبٌ مُجمَعُ

اس شعر میں مجمع بمعنی مجموع ہے۔ اور اس کا دوسرا معنی عزم اور احکام ہے، شاعر نے کہا:

یالیت شِعرِی والمُنَی لاتَنفَعُ هل أغدُوَن یوماً وأمرِی مُجمَعُ

اس شعر میں مجمع بمعنی محکم ہے۔ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا مقاتل اور کلبی نے صفا کا معنی جمیعا کیا ہے۔ بعض نے صفوفا کہا ہے تاکہ تمہاری ہیبت شدید ہو۔ صفا ابوعبیدہ کے قول پر اس لیے منصوب ہے کہ اس پر فعل واقع ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے: أتیت الصف بمعنی میں مسجد میں آیا۔ ابوعبیدہ کے نزدیک اس کا مطلب ہے تم ایسی جگہ پر آؤ جہاں عید کے دن جمع ہوتے ہو۔ بعض فصحاء عرب سے حکایت ہے: ماقدرت أن آتی الصف (مجھے مسجد میں آنے کی قدرت نہ ہوئی) زجاج نے کہا: یہ معنی بھی جائز ہے پھر تم آؤ جبکہ لوگ صفوں میں ہوں۔ اس صورت میں صفا مصدر حال واقع ہو رہا ہوگا اسی وجہ سے اس کی جمع نہیں بنائی گئی۔ ثم ایتوا صفا بھی پڑھا گیا ہے۔ میم کے کسرہ اور یاء کے ساتھ۔ اور جس نے ہمزہ کو ترک کیا تو اس نے ہمزہ سے الف بنا دیا۔

وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾، یعنی غالب آیا۔ یہ تمام گفتگو جادوگروں نے ایک دوسرے کے ساتھ کی۔ بعض نے کہا: یہ فرعون نے جادوگروں سے کہا تھا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً

مُوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝ وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ
اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا
قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۝ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ
لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ
لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ؗ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝

''جادوگر بولے: اے موسیٰ! کیا پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم ہی ہو جائیں پہلے پھینکنے والے۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم ہی پہلے پھینکو، پھر کیا تھا یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا: (اے کلیم!) مت ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اور زمین پر پھینک دو جو (عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے یہ نگل جائے گا جو انہوں نے کاریگری کی ہے، انہوں نے جو کاریگری کی ہے وہ فقط جادوگر کا فریب ہے اور نہیں فلاح پاتا جادوگر جہاں بھی جائے۔ پس گرا دیئے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے، انہوں نے (برملا) کہہ دیا: (اے لوگو! سن لو) ہم ایمان لے آئے ہیں ہارون اور موسیٰ کے رب پر۔ فرعون (گویا رائے ضبط نہ رہا) بولا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں نے تمہیں (مقابلہ کی) اجازت دی وہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سکھایا ہے جادو (کا فن) تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ پاؤں یعنی ایک طرف کا ہاتھ ایک طرف کا پاؤں اور سولی چڑھاؤں گا تمہیں کھجور کے تنوں پر اور تم خوب جان لو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب شدید اور دیر پا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اس سے مراد جادوگر ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی۔ اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ یعنی تم اپنا عصا پھینکو گے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جادوگروں نے ادب کا مظاہرہ کیا یہی ان کا ادب و احترام ان کے ایمان کا سبب بنا۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ کلام میں حذف ہے یعنی فالقوا (انہوں نے ڈالا) حذف ہے اس پر معنی دلالت کر رہا ہے۔ حسن نے عصیهم کو عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون قاری نے کہا: بنی تمیم کی لغت عُصیهم ہے۔ حسن اس کے مطابق پڑھتے تھے۔ باقی قراء نے صاد کے کسرہ کی اتباع کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح دُلِی و دِلِی اور قُسِی و قِسِی ہے۔

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو حیوہ، ابن ذکوان اور روح نے یعقوب سے روایت کر کے تُخَيَّلُ تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے ضمیر عصی اور الحبال کی طرف لوٹائی ہے چونکہ وہ مونث ہیں اس لیے مونث کا صیغہ پڑھا ہے، کیونکہ انہوں نے لاٹھیوں کو پارہ کے ساتھ لت پت کیا ہوا تھا۔ جب انہیں سورج کی دھوپ لگی تو وہ

حرکت کرنے لگیں۔ کلبی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خیال کیا کہ زمین سانپوں والی ہے وہ اس کے بطن میں دوڑ رہے ہیں اور تخیل بمعنی تتخیل بھی پڑھا ہے۔ اس کا طریق بھی تخیل والا طریق ہے۔ اور جنہوں نے یخیل یاء کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس کا مرجع الکید کو بنایا ہے۔ نخیل نون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ آزمائش اور محنت کے لیے خیال پیدا کرنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا فاعل اَنَّهَا تَسْعٰى ہے اور ان محل رفع میں ہے یعنی یخیل الیه سعیها۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ فراء کا خیال ہے کہ ان محل نصب میں ہے یعنی بأنها پھر با کو حذف کیا گیا۔ پہلی صورت میں معنی ہوگا ان کے جادو اور مکر کی وجہ سے انہیں اشتباہ ہوگیا حتی کہ انہوں نے گمان کیا وہ دوڑ رہی ہیں۔ زجاج نے کہا: جس نے تا کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے انّ کو محل نصب میں بنایا یعنی تخیل الیه ذات سعی انہیں دوڑنے والی چیز معلوم ہوئی۔ فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ تخیل میں جو ضمیر ہے اس پر انّ بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو، جو ضمیر الحبال اور العصی کی طرف لوٹ رہی ہے، اس صورت میں بدل اشتمال ہوگا۔ تسعی بمعنی تمشی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ ، او جس بمعنی أضمر ہے دل میں محسوس کیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی پاتا ہے۔ بعض نے کہا: اس کا معنی محسوس کرتا ہے، یعنی سانپوں سے کچھ خوف محسوس کیا یہ وہی ہے جو طبع بشری کو خوف لاحق ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا: آپ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ آپ کے عصا پھینکنے سے پہلے لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ بعض نے کہا: آپ کو خوف ہوا جب عصا ڈالنے کی وحی میں تاخیر ہوئی کہ لوگ اس سے پہلے جدا ہوجائیں گے اور فتنہ میں مبتلا ہوجائیں گے۔ بعض اہل الحقائق نے کہا: اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جادوگروں سے ملے اور آپ نے انہیں فرمایا: (کمبختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹادے گا کسی عذاب سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام متوجہ ہوئے تو جبریل آپ کی دائیں طرف کھڑے تھے تو جبریل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! اللہ کے دوستوں کے ساتھ نرمی کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے جبریل! یہ جادوگر ہیں بڑا جادو لے کر آئے ہیں تاکہ معجزہ کو باطل کریں اور فرعون کے دین کی مدد کریں اور اللہ کے دین کا رد کریں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے نرمی کرو، جبریل نے کہا: یہ اس وقت سے لے کر عصر تک تمہارے پاس ہیں عصر کے بعد یہ جنت میں ہوں گے جب جبریل نے یہ کہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف محسوس ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطرہ لاحق ہوا کہ میرے بارے میں اللہ کا جو علم ہے اس کا مجھے علم نہیں شاید میں اب ایک حالت میں ہوں اور اللہ تعالیٰ کا علم میرے بارے میں اس حالت کے خلاف ہو جیسا کہ یہ لوگ تھے، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خوف کو جان لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ یعنی تم ہی دنیا میں ان پر غالب ہوگے اور جنت میں بلند درجات پر ہوگے۔ اس نبوت واصطفا کے مقام کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا۔ خیفة کی اصل خِوْفَة ہے۔ خا کے کسرہ کی وجہ سے واؤ یاء سے بدل گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا یہ نہیں فرمایا کہ اپنا عصا ڈالو، یہ جائز ہے انکی رسیوں کی

حقارت کے لیے ہو یعنی ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی پروانہ کرو۔ تم وہ ایک چھوٹی سی لکڑی ڈالو جو تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ ایک ان تمام کو نگل جائے گی، وہ چھوٹی سی لکڑی ان تمام بڑی لکڑیوں کو کھا جائے گی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ان کی تعظیم کے لیے ہو یعنی ان بڑے بڑے جسموں والی لکڑیوں کی پروانہ کرو کیونکہ جو چیز تمہارے ہاتھ میں ہے وہ ان تمام سے بڑی ہے۔ یہ کثرت کے باوجود اس کے سامنے کم ہیں۔ پس آپ اسے ڈالیں اللہ کے اذن سے تمام کو نگل جائے گا اور مٹادے گا۔ تَلْقَفْ جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے گویا فرمایا: اگر تو اسے پھینکے گا تو وہ انہیں نگل جائے گا۔ سلمی اور حفص نے تلقف لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ لقف یلقف لقفاً سے مشتق ہے۔ ابن ذکوان، ابو حیوہ شامی، یحییٰ بن حرث نے تلقف تا کے حذف اور فاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ بایں معنی کہ فانھا تتلقف۔ خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ بعض نے کہا: عصا کے لیے ہے۔ اللقف کا معنی تیزی سے پکڑ لینا ہے۔ کہا جاتا ہے: لقفت الشیٔ، قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ لقفہ لقفا، تلقفتہ، یعنی جلدی کے ساتھ اس نے اسے پکڑ لیا۔ یعقوب سے مروی ہے کہا جاتا ہے: رجل لقف ثقف، یعنی چالاک اور دانشمند آدمی۔ اللقف حرکت کے ساتھ دیوار کا گرنا۔ لقد لقف الحوض لقفاً یعنی نیچے سے کھل گیا۔ تلقف وتلقم وتلھم تمام کا معنی ایک ہی ہے؛ یہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ لقمت اللقمۃ لقماً وتلقمتھا اس کا معنی ہے لقمہ کو آسانی سے نگل لیا۔ اسی طرح لھمہ (ھاء کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی نگل جانا ہے۔ مَا صَنَعُوْا یعنی جو انہوں نے کیا اسی طرح اِنَّمَا صَنَعُوْا یعنی إن الذی صنعوہ، کید رفع کے ساتھ ہے (سحر) سین کے کسرہ اور حاء کے سکون کے ساتھ۔ یہ عصام کے سوا کوفیوں کی قرأت ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ کید، السحر کی طرف مضاف ہو، اتباع کی بنا پر حذف کی تقدیر کے بغیر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کلام میں حذف ہو یعنی کید ذی سحر، باقی قراء نے کیدَ، نصب کے ساتھ اس پر صنع کے وقوع کے ساتھ۔ ما کافہ ہے۔ ساحر میں اضافت کی وجہ سے ضمیر مضمر نہ ہوگی۔ الکید اس قرأت پر حقیقت میں ساحر کے لیے مضاف ہے سحر کے لیے نہیں۔ ان کا فتحہ جائز ہے اس معنی پر لانّ ماصنعوا کید ساحر کہ جو انہوں نے کیا وہ جادوگر کا مکر وفریب ہے۔ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى یعنی زمین کی کسی جہت سے آئے جادوگر کامیاب نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا: جہاں حیلہ کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ساحر کا حکم اور سحر کا معنی گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا، جب انہوں نے عصا میں عظیم امر اور خارق لاعادت امر دیکھا تو وہ سجدہ میں گر گئے اس عصا نے رسیوں اور لاٹھیوں کے ذریعے جو مکر وفریب کیا تھا سب کو نگل لیا۔ وہ بوجھ جو رسیوں اور لاٹھیوں کا تھا تین سو اونٹ کا تھا، پھر ایک عصا رہ گیا۔ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ رسیاں اور لاٹھیاں کہاں ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ یہ مفہوم اور عصا کا مسئلہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۞ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ، لہ بمعنی بہ ہے۔ کہا جاتا ہے: آمن لہ وآمن بہ، اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (العنکبوت: 26) اور سورۃ الاعراف آیت 123 میں ہے: قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ، فرعون کی طرف سے جادوگروں پر انکار ہے یعنی تم نے تجاوز کیا اور تم نے وہ کیا جس کا میں نے حکم نہیں دیا ہے۔ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ یعنی تعلیم میں جو تمہارا رئیس ہے۔ وہ تم پر غالب آگیا کیونکہ وہ

جادوگری میں تم سے زیادہ ماہر تھا۔ فرعون نے اپنے اس قول سے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں میں اشتباہ پیدا کردے تاکہ لوگ ان کی اتباع نہ کریں اور ان کی طرح لوگ بھی ایمان نہ لے آئیں ورنہ فرعون جان چکا تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کچھ نہیں سیکھا ہے بلکہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے اور ان کی ولادت ہونے سے پہلے جادو جانتے تھے۔ **فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ**، یعنی علی جذوع النخل، سوید بن ابی کاہل نے کہا:

هُمْ صَلَبُوا العبدیّ فی جذع نخلة　　فلا عَطَسَتْ شیبانُ إلّا بأجْدَعا

پس ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور سولی پر چڑھائے گئے حتی کہ وہ وصال کر گئے۔ پس اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ ابن محیصن نے یہاں اور سورۃ الاعراف میں فلاقطعن ولاصلبنکم کو الف کے فتحہ کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قطع اور صلب سے مشتق کیا ہے۔ **وَلَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰی**۝ یعنی میں یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رب؟۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ۝ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ۝ اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی ۝ وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی ۝

''انہوں نے کہا: (اے فرعون!) ہمیں اس کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہم ہرگز ترجیح نہیں دیں گے تجھے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں پس (ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کردے (ہمیں ذرا پروا نہیں) تو صرف اس (فانی) دنیوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔ یقیناً ہم ایمان لائیں گے اپنے رب پر تاکہ وہ بخش دے ہمارے لیے ہماری خطاؤں کو اور اس قصور کو اور اس قصور کو بھی جس پر تم نے مجبور کیا تھا یعنی فن سحر اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ بیشک جو شخص بارگاہ الٰہی میں مجرم بن کر آئے تو اس کے لیے جہنم (کا شعلہ زار) ہے نہ وہ مر ہی سکے گا اس میں اور نہ وہ زندہ ہوگا۔ اور جو شخص حاضر ہوگا بارگاہ الٰہی میں مومن بن کر اس حال میں کہ اس نے عمل بھی نیک کیے ہوں تو یہ وہ (سعادت مند) ہیں جن کے لیے بلند درجات ہیں، یعنی سدابہار باغات رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ (خوش نصیب) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے جزا ان کی جنہوں نے (اپنا دامن ہر آلائش سے) پاک رکھا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَالُوْا** جادوگروں نے کہا: **لَنْ نُّؤْثِرَكَ** ہم تجھے اختیار نہیں کریں گے۔ **عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: البینات سے مراد یقین اور علم ہے۔ عکرمہ وغیرہ نے کہا: جب انہوں نے سجدہ کیا تو سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی جنت میں منازل دکھائیں اسی وجہ سے انہوں نے کہا: ہم تجھے ترجیح نہیں دیں گے۔ **فَاقْضِ مَاۤ**

اَنْتَ قَاضٍ تقدیر عبارت اس طرح ہے، ما انت قاضیه اور یہاں ما جو فعل کو ملاتا ہے مصدر کے قائم مقام نہیں ہے کیونکہ وہ افعال کو ملاتا ہے اور یہ مبتدا اور خبر کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تو کر لے جو تو کرنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تو فیصلہ کر جو تو کرنے والا ہے یعنی ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ یا کو قاضی سے حذف کیا گیا ہے کیونکہ یا ساکن ہے اور دوسرا تنوین کا سکون ہے۔ سیبویہ نے وقف میں یا کے اثبات کو اختیار کیا ہے، کیونکہ اس صورت میں التقاء ساکنین کی علت زائل ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۝ تیرا امر صرف اس دنیاوی زندگی پر نافذ ہوگا۔ یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے مطلب یہ ہے تو اس دنیا کے مال ومتاع میں فیصلہ کرتا ہے یا اس دنیا کے وقت میں فیصلہ کرتا ہے پس مفعول کا حذف مقدر ہے۔ پس یہ تقدیر عبارت بھی جائز ہے انما تقضی أمور هذه الحیاة الدنیا اس صورت میں نصب بھی مفعول کی نصب کی طرح ہوگی اور ما، إنّ کے عمل کو روکنے والا ہے۔ فراء نے رفع کو جائز قرار دیا ہے اس بنا پر کہ ما معنی الذی ہو اور تَقْضِيْ سے ضمیر کو حذف کیا گیا ہو اور هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا کو رفع دیا جائے۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا یعنی ہم اللہ وحدہ لاشریک پر اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا اس سے مراد وہ شرک ہے جس پر پہلے وہ تھے۔

وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ما محل نصب میں ہے اور الخطایا پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا کوئی محل نہیں ہے اور یا نافیہ ہے یعنی لیغفر لنا خطایانا من السحر وما اکرهتنا علیه۔ نحاس نے کہا: پہلا قول اولیٰ ہے۔ مہدوی نے کہا: اس میں بُعد ہے کیونکہ ان کا قول ہے: انّ لنا لاجرا ان کُنّا نحن الغالبین، یہ مکرهین (مجبور) کا قول نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اکراہ کی صورت میں گناہ نہیں ہوتا اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ بچپن میں انہیں جادو سیکھنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ حسن نے کہا: وہ چھوٹے بچوں کو جادو سکھاتے تھے پھر بعد میں خود اس پر اپنی مرضی سے عمل کرتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور خبر مضمر ہو۔ تقدیر عبارت یہ ہو: وما اکرهتنا علیه من السحر موضوع عنا اور من ساحر اس قول پر اور پہلے قول کی بنا پر اکرهتنا کے متعلق ہوگا۔ اور ما کو نافیہ بنانے کی صورت میں خطایانا کے متعلق ہوگا۔ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى یعنی اس کا ثواب بہتر ہے اور دیرپا ہے، مضاف کو حذف کیا گیا ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمارے لیے تجھ سے بہتر ہے اور وہ جو ہمیں عذاب دے گا تیرے عذاب دینے کی نسبت زیادہ دیرپا ہے۔ یہ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى کا جواب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے لیے بہتر ہے اگر ہم اس کی اطاعت کریں اور ہم اس کی نافرمانی کریں تو وہ تجھ سے زیادہ ہمیں عذاب دینے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا بعض علماء نے فرمایا: یہ ان جادوگروں کا قول ہے جب وہ ایمان لائے تھے۔ بعض نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا آغاز ہے۔ اور انه کی ضمیر کا مرجع الامر اور الشان ہے۔ اور انّ من یات بھی جائز ہے:

اِنّ من یَدخلِ الکنیسةَ یوماً　یلْقَ　فیها　جآذِراً　وظِبَاءَ

اس میں مراد انه من یدخل ہے یعنی انّ الأمر هذا مجرم دوزخ میں داخل ہوگا اور مومن جنت میں داخل ہوگا۔ مجرم سے

تبعه و أتبعه، لحقه اور الحقه کا ایک معنی ہے ملنا اور بِجُنُودِهٖ حال واقع ہو رہا ہے گویا فرمایا: فاتبعهم سائقاً جنوده یعنی اپنے لشکر کو چلاتے ہوئے ان کا پیچھا کیا۔ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ۔ یعنی سمندر کی موجیں لاحق ہوئیں جنہوں نے انہیں غرق کر دیا۔ تعظیم اور امر کی معرفت کی وجہ سے فعل کو مکرر ذکر کیا۔ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى یعنی رشد سے فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور خیر اور نجات کی طرف ان کی راہنمائی نہیں کی، کیونکہ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اس سے بچ نہیں سکیں گے کیونکہ ان کے آگے سمندر ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر عصا مارا تو اس میں بارہ راستے بن گئے اور راستوں سے پانی پہاڑوں کی مثل رک گیا اور سورہ شعراء میں ہے: فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ (الشعراء) یعنی بہت بڑا پہاڑ۔ ہر قبیلہ نے راستہ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پانی کے پہاڑوں کو حکم دیا کہ وہ جال کی طرح ہو جائیں تو وہ جالوں کی طرح ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی کلام سنتے تھے۔ یہ عظیم معجزات میں سے تھا اور بڑی نشانیوں میں سے تھا۔ جب فرعون آیا اور سمندر میں راستے دیکھے اور پانی کو ٹھہرا ہوا دیکھا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا: اس کی ہیبت کی وجہ سے سمندر پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ پس فرعون اور اس کے ساتھی داخل ہو گئے تو سمندر ان پر مل گیا۔ بعض علماء نے کہا: وَ مَا هَدٰى اس کے ان کو گمراہ کرنے کی تاکید کے لیے ہے۔ بعض نے کہا: یہ فرعون کے قول: مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ (غافر) کا جواب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کی تکذیب کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وَ مَا هَدٰى یعنی اس نے اپنے آپ کو راہ ہدایت نہ دکھائی بلکہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو ہلاک کر دیا۔

يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

''اے بنی اسرائیل! (دیکھو) ہم نے بچا لیا تمہیں تمہارے دشمن سے اور ہم نے تم سے وعدہ کیا (کوہ) طور کی دائیں جانب کا اور ہم نے اُتارا تم پر من وسلویٰ۔ کھاؤ ان پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ اترے گا تم پر میرا عذاب، اور وہ (بدنصیب) اترتا ہے جس پر میرا غضب تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے۔ اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے بعد ازاں ہدایت پر مستحکم رہتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دی تو یہ فرمایا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ، جَانِبَ پر نصب، واعدنا کے مفعول ثانی کی بنا پر ہے اور اسے ظرف کی بنا پر نصب دینا بہتر نہیں کیونکہ یہ ظرف مکاں محض غیر مبہم ہے اور افعال اور مصادر ظروف مکاں

کی طرف بغیر حروف جر کے متعدی ہوتے ہیں جبکہ وہ ظروف مبہم ہوں۔ مکی نے کہا: یہ اصل ہے اس میں اختلاف نہیں ہے۔ آیت کی تقدیر یہ ہے: وواعدناکم اتیان جانب الطور، پھر مضاف کو حذف کیا گیا۔ نحاس نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ نکلنے کا حکم دیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے تمہاری موجودگی میں کلام کریں اور تم بھی اس کلام کو سن لو۔ بعض نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کے غرق ہونے کے بعد طور کی جانب آنے کا وعدہ لیا تاکہ انہیں تورات عطا کریں پس وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھا لیکن خطاب انہیں کیا گیا کیونکہ وعدہ ان کے لیے تھا۔ ابو عمرو نے ووعدناکم بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ابو عبید نے بھی اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھا اور المواعدہ صرف دو افراد کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ الایمن کو نصب دی گئی ہے کیونکہ یہ جانب کی صفت ہے اور پہاڑ کے لیے کوئی دایاں بایاں نہیں ہوتا جب کہا جاتا ہے: خذ عن یمین الجبل تو اس کا معنی ہوتا ہے تم اپنی دائیں جانب پر پہاڑ کو پکڑو۔ اس وقت پہاڑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب پر تھا جب وہ وہاں آئے تھے۔ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى یعنی تیہ کے صحرا میں ہم نے تم پر من وسلویٰ اُتارا۔ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ یعنی لذیذ رزق سے۔ بعض نے کہا: طیب سے مراد حلال رزق ہے جبکہ آدمی کا اس میں کوئی دخل نہیں ورنہ اس میں شبہ داخل ہو جاتا۔ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ یعنی خوشحالی اور عافیت تمہیں نافرمانی پر نہ اُبھارے، کیونکہ الطغیان کا معنی ہوتا ہے ناجائز چیز کی طرف تجاوز کرنا۔ بعض نے کہا: اس کا معنی ہے نعمت کا انکار نہ کرو اور نعمتوں کے شکر کو نہ بھولو اور منعم کے شکر کو نہ بھولو جس نے تم پر انعام کیا۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے ان کے بدلے دوسری چیزیں طلب نہ کرو جیسا کہ فرمایا: اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ (البقرہ: 61) بعض نے کہا: ایک دن اور ایک رات سے زائد کے لیے اس میں سے ذخیرہ نہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو وہ ذخیرہ کریں ان میں کیڑے پیدا کردیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی کسی کھانے میں کیڑا پیدا نہ ہوتا۔ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ یعنی تم پر میرا غضب لازم ہوگا اور غضب اترے گا یہ فا کے ساتھ جواب نہی میں منصوب ہے نہی سے مراد وَ لَا تَطْغَوْا ہے۔ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى، اعمش، یحییٰ بن وثاب اور کسائی نے فیحل میں حاء کے ضمہ کے ساتھ اور من یحلل میں پہلے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دو لغتیں ہیں۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے حکایت کیا ہے: حَلَّ يَحِلُّ کہا جاتا ہے: جب واجب ہو اور حل يَحُلُّ کہا جاتا ہے جب اترے۔ اسی طرح فراء نے کہا: الحلول سے یحل حاء کے ضمہ کے ساتھ وقوع کے معنی میں ہوتا ہے اور یحل حاء کے کسرہ کے ساتھ وجوب کے معنی میں ہوتا ہے دونوں معانی متقارب ہیں لیکن کسرہ اولیٰ ہے کیونکہ قراء کا وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (الزمر) پر اجماع ہے۔ غضب اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا عقاب، انتقام اور عذاب ہے۔ فَقَدْ هَوٰى زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے وہ ہلاک ہوا یعنی وہ ہاویہ کی طرف چلا۔ ہاویہ سے مراد دوزخ کی گہرائی ہے۔ یہ ھوی یھوی ھویا سے ہے جس کا معنی ہے اوپر سے نیچے کی طرف گرنا۔ ھوی فلان یعنی فلاں مرگیا۔ ابن المبارک نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں اسماعیل بن عیاش نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں

ثعلبہ بن مسلم نے بیان کیا انہوں نے ایوب بن بشر سے انہوں نے شفی اصبحی سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جہنم میں ایک پہاڑ ہے اسے صعود کہا جاتا ہے، کافر اس پر چڑھنے سے پہلے چالیس سال چلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ (مدثر) جہنم میں ایک محل ہے جس کو ھویٰ کہا جاتا ہے کافر کو اس کے اوپر سے پھینکا جائے گا پس وہ اس کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال گرتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ حدیث ذکر فرمائی جو ہم نے ''التذکرہ'' کتاب میں ذکر کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ یعنی جس نے شرک سے توبہ کی۔ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ یعنی ایمان پر قائم رہا حتی کہ ایمان پر ہی وصال ہوا، یہ سفیان ثوری اور قتادہ وغیرہما کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی ایمان میں شک نہ ہوا، یہ ماوردی اور مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی قول ہے کہ جو سنت و جماعت پر قائم رہا، یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت انس نے کہا: اس نے نبی کریم ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑا، یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے اور یہ ماوردی نے حضرت ربیع بن انس سے روایت کیا ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ درست عمل کیا، یہ حضرت ابن زید کا قول ہے۔ حضرت ابن زید سے یہ بھی مروی ہے کہ اس نے علم حاصل کیا تاکہ ہدایت پائے کہ کیسے عمل کرے؟ پہلا قول مہدوی نے ذکر کیا اور دوسرا قول ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی، مقاتل اور کلبی نے کہا: اس نے جان لیا کہ اس کے لیے ثواب اور عقاب ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ آٹھواں قول ثُمَّ اهْتَدٰى پھر اہل بیت نبی ﷺ کی ولایت میں ہدایت پائی؛ یہ ثابت بنانی کا قول ہے۔ پہلا قول تمام اقوال سے احسن ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تمام اقوال کا مرجع وہی ہے۔ وکیع نے سفیان سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں سنتے ہیں وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ یعنی جس نے شرک سے توبہ کی اٰمَنَ یعنی شرک کے بعد ایمان لایا وَ عَمِلَ صَالِحًا نماز پڑھی اور روزہ رکھا ثُمَّ اهْتَدٰى پھر اسی پر فوت ہوا۔

وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِيْ وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ
لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ
مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ۬ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ
اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ
مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ
الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ
فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۬ۙ وَّ لَا
يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

''اور کس وجہ سے تم جلدی آگئے اپنی قوم سے اے موسیٰ! عرض کی: وہ یہ ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی جلدی

تیری بارگاہ میں اس لیے حاضر ہوا ہوں میرے رب کہ تو راضی ہو جائے۔ ارشاد ہوا کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے۔ (یہ سنتے ہی) لوٹے موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر ہو کر، فرمایا: اے میری قوم! کیا وعدہ نہیں کیا تھا تم سے تمہارے رب نے بہت عمدہ وعدہ تو کیا طویل مدت گزر گئی ہے اس وعدہ پر (اور تم اس کے ایفاء سے مایوس ہو گئے) یا تم چاہتے ہو کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کی طرف سے اس لیے تم نے توڑ ڈالا میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ۔ کہنے لگے: نہیں توڑا ہم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ اپنے اختیار سے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر لاد دیئے گئے تھے بوجھ قوم (فرعون) کے زیورات سے سو ہم نے (سامری کے کہنے پر) انہیں پھینک دیا اسی طرح سامری نے بھی (اپنے حصہ کے زیور) پھینک دیئے۔ پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا پھر سامری اور اس کے چیلوں نے کہا: (اے فرزندان یعقوب) یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے۔ کیا ان احمقوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ تجھے کس چیز نے ابھارا کہ تم اپنی قوم سے پہلے آ گئے؟ بعض علماء نے فرمایا: قوم سے مراد تمام بنی اسرائیل ہیں اس وجہ سے بعض علماء نے فرمایا: حضرت ہارون کو بنی اسرائیل پر خلیفہ بنایا تھا اور خود ستر آدمیوں کے ہمراہ چل رہے تھے اور آپ کی طرف متوجہ تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ میرے قریب میری واپسی کے منتظر ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے پیچھے بنی اسرائیل کو لانے کا حکم دیا اور ان سے ملنے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: قوم سے مراد وہ ستر افراد ہیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے منتخب فرمایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور کے قریب تھے تو کلام الٰہی کے سننے کے شوق میں سبقت لے گئے۔ بعض نے کہا: جب طور سینا کی طرف چلے تو اپنے رب کا اشتیاق ہوا اور شوق الٰہی میں مسافت لمبی ہو گئی اور معاملہ انتہائی تنگ ہو گیا حتیٰ کہ آپ نے اپنی قمیص پھاڑ دی پھر آپ صبر نہ کر سکے حتیٰ کہ قوم کو پیچھے چھوڑ گئے اور اکیلے چلے گئے جب اپنے مقام پر کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام حیرانگی کے عالم میں کوئی جواب نہ دے سکے چونکہ سچے شوق سے استقبال کیا تھا تو جواب سے اعراض کیا اور کنایۃً کہا: هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ۔ ما کے کلمہ کے ساتھ جلدی آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے پیچھے آنے کی خبر دی پھر عرض کی: وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ شوق کے ذکر سے کنایہ فرمایا اور رضا کی طلب کی طرف کلام کو پھیرا۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے قتادہ سے وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ کے تحت روایت کیا کہ تیرا شوق مجھے جلدی لے آیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب اپنے بستر پر آتی تھیں تو کہتی تھیں: مجید (عزت والے) کو لے آؤ پس پر قرآن کریم لایا جاتا وہ اسے اپنے سینے سے لگاتیں اور اس سے تسلی لیتی ہوئے سو جاتی تھیں، سفیان نے مسعر سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ جب بارش ہوتی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے

اتار دیتے تھے تا کہ جسم پر بارش لگے اور فرماتے تھے: انہ حدیث عہد بربی(1) (یہ میرے رب کا قریبی عہد ہے) یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور آپ کے بعد والوں کی طرف سے شوق و محبت کی وجہ سے تھا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے جو مروی ہے اس میں فرمایا: ''میری ملاقات کا شوق نیکوکاروں کے لیے طویل ہوا اور میں ان کی ملاقات کا شوق رکھتا ہوں'' (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن پھر فرمایا: مَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ، تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحمت ہے اس قول سے انہیں عزت بخشنا اور ان کے دل کو تسلی دینا اور ان پر شفقت کرنا مقصود تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کو جواب دیتے ہوئے کہا: هُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ۔ ابو حاتم نے کہا: عیسیٰ نے کہا بنو تمیم کہتے ہیں: ہم اولیٰ یعنی مقصورہ مرسلہ پڑھتے ہیں اور اہل حجاز اولاء مد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فراء نے: هُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ حکایت کیا ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: اس کی کوئی وجہ نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ اسی طرح ہے جس طرح زجاج نے کہا ہے کیونکہ یہ ان اسماء سے نہیں جو مضاف ہوتے ہیں تا کہ یہ ھدای کی طرح ہو، یہ دو جہتوں میں سے ایک سے خالی نہیں یا یہ اسم مبہم ہوگا تو اس کی اضافت محال ہے یا یہ الذین کے معنی میں ہوگا تو یہ بھی مضاف نہیں ہوتا کیونکہ اس کے بعد صلہ ہوتا ہے اور اس سے یہ معرفہ بن جاتا ہے۔ ابن ابی اسحاق، نصر، رویس نے یعقوب سے روایت کیا ہے: علی إثری، ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ یہ بمعنی اثر ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ۝ یعنی میں نے اس جگہ کی طرف جلدی کی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا تا کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کہا جاتا ہے: رَجلٌ عَجِلٌ وعَجُلٌ وعَجُولٌ وعَجْلَانُ بیِّنَ العَجَلة اور سستی کی ضد عجلة ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۢ بَعۡدِكَ، ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر استدلال کریں۔ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ۝ سامری نے انہیں گمراہی کی طرف بلایا یا سامری ان کی گمراہی کا سبب تھا۔ بعض نے فرمایا: فتناهم کا مطلب ہے ہم نے انہیں فتنہ میں ڈالا یعنی ہم نے ان کے بچھڑے کی عبادت کو مزین کر دیا۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اِنۡ هِىَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ (الاعراف: 155) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سامری اس قوم سے تھا جو گائے کی پوجا کرتے تھے پس وہ مصر میں آیا تو وہ بظاہر بنی اسرائیل کے دین میں داخل ہو گیا اور اس کے دل میں گائے کی عبادت کا عقیدہ موجود تھا۔ بعض علماء نے کہا: وہ قبطی تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پڑوسی تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تھا اور آپ کے ساتھ نکلا تھا۔ بعض نے کہا: وہ بنی اسرائیل کے عظماء میں سے ایک عظیم شخص تھا اس قبیلہ سے تھا جو سامرہ کے نام سے مشہور تھا وہ شام میں معروف تھا۔ سعید بن جبیر نے کہا: وہ اہل کرمان سے تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَرَجَعَ مُوۡسٰۤى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا سورۃ الاعراف میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جب وہ اس کی اطاعت پر قائم رہیں گے تو انہیں جنت ملے گی اور ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر تورات میں اپنا کلام سنائے گا تا کہ وہ اس پر عمل کریں جو کچھ تورات میں موجود ہے اور وہ اپنے عمل کے ثواب کے مستحق ہو جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان سے نصرت و کامیابی کا وعدہ فرمایا تھا۔ بعض نے کہا: یہ

1۔ مسند احمد، حدیث نمبر 12365　2۔ فردوس دیلمی، حدیث نمبر 8067

وعدہ تھا، وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ۔ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو بھول گئے۔ کہا جاتا ہے: زمانہ کے لمبا ہو جانے کی وجہ سے چیز بھول جاتی ہے۔ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، یحل کا معنی یجب اور ینزل (ثابت ہونا اور اترنا) ہے الغضب سے مراد عقوبت و نقمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تم ایسا فعل کرو جو تم پر اللہ کے غضب کے نزول کا سبب ہو کیونکہ کوئی شخص اللہ کا غضب طلب نہیں کرتا بلکہ وہ ایسا فعل کرتا ہے جو غضب کا سبب ہوتا ہے۔

فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ تم نے میرے عہد کو توڑا کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں گے حتی کہ وہ طور سے ہو کر ان کے پاس واپس آجائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اپنے پیچھے رہنے کا ان سے وعدہ لیا تھا پس وہ ٹھہرے رہے۔ قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا، بملکنا میم کے فتح کے ساتھ ہے یہ نافع، عاصم اور عیسیٰ بن عمر کی قرأت ہے۔ مجاہد اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے بطاقتنا (اپنی طاقت سے) ابن زید نے کہا: اس کا مطلب ہے ہمیں اپنے نفسوں پر ضبط نہ تھا ہم مجبور تھے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے بملکنا میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے: ابو عبید اور ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ لغت عالیہ ہے۔ یہ ملکت الشیٔ أملکه ملکا کا مصدر ہے۔ اور مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے اور مفعول محذوف ہے گویا فرمایا: بملکنا الصواب بل اخطأنا، یہ ان کی طرف سے خطا کا اعتراف ہے۔ حمزہ، کسائی نے بملکنا میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی بسلطاننا ہمارے پاس ملک نہ تھا پس ہم نے تیرے وعدہ کی خلاف ورزی کی پھر کہا گیا کہ قالوا عام ہے اور مراد خاص ہے یعنی ان لوگوں نے کہا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور سے لوٹنے تک اطاعت پر ثابت رہے تھے۔ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا یہ بارہ ہزار تھے اور تمام بنی اسرائیل چھ لاکھ تھے۔ وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ حا، کے ضمہ اور میم کے مکسورہ مشددہ کے ساتھ۔ نافع، ابن کثیر، حفص اور رویس نے اس طرح پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حروف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید اور ابو حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ انہوں نے خود قوم کے زیورات اُٹھائے تھے اور انہوں نے یہ مجبوراً نہیں اٹھائے تھے۔ اَوْزَارًا یعنی بوجھ، مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ یعنی ان کے زیوروں سے وہ انہوں نے عاریۃ لیے تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے کا ارادہ کیا تھا اور قوم والوں کو یہ وہم دلایا کہ وہ اپنی عید یا ولیمہ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ زیورات تھے جو انہوں نے آل فرعون سے لیے تھے جب دریا نے انہیں ساحل پر پھینک دیا تھا ان کو اوزار اس لیے کہا کیونکہ وہ گناہ کا سبب تھے یعنی ان کے لیے ان کا اٹھانا جائز نہیں تھا اور نہ ان کے لیے غنائم حلال تھے اور لغت میں اوزار کا معنی بوجھ بھی ہے۔

فَقَذَفْنٰهَا ہم پر ان زیورات کا اٹھانا بوجھ بن گیا تھا جو ہمارے ساتھ تھے تو ہم نے انہیں آگ میں ڈال دیا تاکہ وہ پگھل جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم نے سامری کی طرف انہیں پھینک دیا تاکہ آپ واپس آئیں اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔ قتادہ نے کہا: سامری نے انہیں کہا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس نہ پہنچے کہ وہ تم سے اس وجہ سے رک گئے ہیں کیونکہ تمہارے پاس زیورات ہیں، پس انہوں نے زیورات کو جمع کیا اور سامری کو دے دیئے اس نے انہیں آگ میں پھینک دیا اور پھر اس سے ان کے لیے ایک بچھڑا بنایا پھر اس پر جبریل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے جو مٹی اٹھائی تھی

وہ اس پر ڈال دی جب اس نے وہ مٹی ڈالی تو وہ بچھڑے کا جسم بن گیا جو ڈکارتا تھا۔ الخوار گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب وہ زیور آگ میں ڈالے گئے تو سامری آیا اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا: اے اللہ کے نبی! کیا میں ڈالوں جو میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ گمان کر رہا تھا کہ وہ زیورات میں سے ہے جو دوسرے لے کر آئے ہیں۔ پس اس نے اس میں مٹی ڈالی اور کہا: بچھڑا بن جا جس کے لیے ڈکارنے کی آواز ہو جیسا کہ فرمایا کہ یہ فتنہ اور آزمائش کے لیے تھا۔ پس وہ ایک مرتبہ ڈکارا تھا پھر اس کی مثل نہیں ڈکارا تھا(1)۔ بعض نے کہا: اس کی آواز ہوا کی وجہ سے تھی کیونکہ اس میں سوراخ بنائے گئے تھے جب اس کے اندر ہوا داخل ہوتی تو اس میں آواز پیدا ہوتی۔ حقیقۃً اس میں زندگی نہیں تھی؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ پہلے قول کی بنا پر وہ بچھڑا گوشت اور خون کا تھا؛ یہ حسن، قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ حماد نے سماک سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت ہارون سامری کے پاس سے گزرے وہ بچھڑا بنا رہا تھا حضرت ہارون نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ نفع دے گا نقصان نہیں دے گا۔ حضرت ہارون نے دُعا کی: یا اللہ! اسے وہ عطا کر جو یہ تجھ سے آپ کے بارے سوال کرے تو سامری نے یہ دعا کی: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ گائے کی طرح آواز نکالے۔ وہ جب ڈکارتا تھا تو لوگ سجدہ میں گر جاتے تھے اور اس کا ڈکارنا حضرت ہارون کی دعا کے سبب تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اس طرح ڈکارتا تھا جس طرح زندہ بچھڑا ڈکارتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا رب! اس سامری نے ان کے لیے ایک جسم والا بچھڑا نکالا ہے جس کے لیے ڈکارنا ہے اور وہ اس نے ان کے زیورات سے بنایا ہے یہ جسم اور ڈکارنا کس نے بنایا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تیری عزت، تیرے جلال، تیرے ارتفاع، تیرے علو اور تیری سلطنت کی قسم! تیرے سوا کسی نے ان کے حق میں گمراہی کو مقدر نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے حکیم الحکماء! تو نے سچ کہا ہے۔ یہ تمام سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى سامری اور اس کے ساتھیوں نے یہ کہا وہ تشبیہ کے عقیدہ کی طرف مائل تھے کیونکہ انہوں نے کہا: **اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ** (الاعراف: 138) ہمارے لیے ایسا اِلٰہ بنا جس طرح ان کے لیے الٰہ ہیں۔ **فَنَسِيَ** یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام گم ہو گئے۔ وہ اپنے رب کو تلاش کرنے کے لیے گئے تو وہ اس کا مقام نہ جان سکے اور راستہ جو رب کی طرف جانے والا تھا اسے بھول گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے وہاں چھوڑا اور اسے تلاش کرنے کے لیے نکلے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اِلٰہ کو یہاں چھوڑا۔ اسرائیل نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا: اس کا مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے لیے یہ ذکر کرنا بھول گئے کہ یہ خدا ہے۔ بعض نے کہا: خطاب سامری کے متعلق خبر ہے یعنی سامری نے اس ایمان کو چھوڑا جس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے حکم دیا تھا۔ پس وہ گمراہ ہو گیا؛ یہ ابن الاعرابی کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: **اَفَلَا يَرَوْنَ** یعنی وہ اس میں غور وفکر نہیں کرتے کہ وہ ان کی طرف بات کو نہیں لوٹاتا یعنی ان سے

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

کلام نہیں کرتا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ دوبارہ آواز نہیں نکالتا۔ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ اور وہ ان کے نقصان اور نفع کا مالک نہیں پھر وہ کیسے خدا ہو سکتا ہے۔ اور وہ ذات جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام عبادت کرتے ہیں وہ نقصان بھی دیتا ہے اور نفع بھی دیتا ہے، بدلہ بھی دیتا ہے، عطا بھی کرتا ہے اور منع بھی کرتا ہے۔ اَلَّا يَرْجِعُ اس کی تقدیر یہ ہے کہ: انه لا يرجع اسی وجہ سے فعل مرفوع ہے ان کو مخففہ بنایا گیا اور ضمیر کو حذف کیا گیا۔ رویت، علم اور ظن میں یہی اختیار ہے۔ شاعر نے کہا:

فی فتيةٍ من سيوف الهند قد علموا　　أَنْ هالكٌ كلُّ من يَحْفَى وينتعلُ

فلو كنتَ ضَبِّيًا عرفتَ قرابتي　　ولكنَّ زنجيٌّ عظيمُ المشافرِ

یعنی لکنتک تھا۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾

"اور بیشک کہا تھا انہیں ہارون نے (موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم! تم فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔ قوم نے کہا: ہم تو اسی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام) موسیٰ نے (آ کر غصہ سے) کہا: اے ہارون! کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا، تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا کیا تو نے بھی میرے حکم کی عدولی کی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی سے پہلے حضرت ہارون نے انہیں کہا: يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ اس کے ذریعے تم آزمائش میں ڈالے گئے ہو اور تم اسی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہو۔ بہ کی ضمیر کا مرجع بچھڑا ہے۔ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ بیشک تمہارا رب رحمٰن ہے، بچھڑا نہیں۔ فَاتَّبِعُوْنِيْ اس کی عبادت کرنے میں میری اتباع کرو۔ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ اور میرے حکم کی اطاعت کرو نہ کہ سامری کے حکم کی۔ یا یہ مطلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف چلنے میں میری اتباع کرو اور بچھڑے کو چھوڑو، لیکن انہوں نے نافرمانی کی۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ یعنی ہم بچھڑے کی عبادت پر جمے رہیں گے۔ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ہم دیکھیں گے کہ کیا وہ اس کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ہم کرتے ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بچھڑے کی عبادت کریں گے۔ حضرت ہارون نے ان بارہ ہزار کو علیحدہ کر لیا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور شور و غل سنا وہ لوگ اس بچھڑے کے اردگرد ناچتے تھے۔ آپ نے اپنے ستر ساتھیوں سے کہا: یہ فتنہ کی آواز ہے۔ جب حضرت ہارون کو دیکھا تو

دائیں ہاتھ سے غصہ کی حالت میں ان کے سر کے بال پکڑ لیے اور بائیں ہاتھ سے داڑھی کے بال پکڑ لیے (1) اور کہا: قَالَ یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْۤا کہا اے ہارون! تجھے کس چیز نے روکا جب تو نے انہیں دیکھا کہ گمراہ ہو گئے ہیں حق کے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور کفر کیا ہے۔ اَلَّا تَتَّبِعَنِ کہ تم میرے پیچھے آجاتے۔ لازائدہ ہے یعنی تم میرے امر اور میری وصیت کی پیروی کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ان پر انکار کرنے سے اور میری اتباع سے تجھے کونسی بات مانع تھی۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے تم نے ان سے جنگ کیوں نہیں کی جبکہ تجھے معلوم تھا کہ اگر میں ان کے درمیان ہوتا تو میں ان کے کفر پر ان سے جنگ کرتا۔ بعض علماء نے کہا: جب یہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے تو تجھے مجھ سے ملنے سے کیا چیز مانع تھی۔ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ اس سے مراد یہ ہے کہ تیرے ان کے درمیان ٹھہرنا جبکہ یہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے تیری طرف سے میری نافرمانی ہے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے تو ان سے جدا کیوں نہیں ہوا تا کہ تیرا ان سے جدا ہونا ان کو زجر و توبیخ کے لیے ہوتا اور اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ کا معنی بعض علماء نے فرمایا: امری سے مراد جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سے حکایت تھا۔ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ۝ (الاعراف) جب حضرت ہارون علیہ السلام ان کے ساتھ ٹھہرے رہے اور انہیں روکنے میں مبالغہ نہ کیا اور ان پر انکار نہ کیا تو عصیان اور مخالفت امر کی نسبت ان کی طرف کر دی۔

مسئلہ: یہ امر بالمعروف اور نہی المنکر میں اصل ہے، اس کو تبدیل کرنا اور برائی کرنے والوں سے جدا ہو جانا ان کے درمیان ٹھہرنے والا خصوصاً جبکہ وہ راضی ہو تو اس کا حکم ان کے حکم کی طرح ہوگا۔ یہ مفہوم سورۂ آل عمران، النساء، مائدہ، الانعام، الاعراف اور الانفال میں گزر چکا ہے۔ امام ابوبکر طرطوشی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ہمارے سردار فقیہ مذہب صوفیاء میں کیا کہتے ہیں؟ ایک جماعت جمع ہوتی ہے وہ کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں پھر وہ ڈھول بجاتے ہیں، بعض رقص کرنے لگتے ہیں اور وجد میں آجاتے ہیں حتی کہ بے ہوش ہو جاتے ہیں پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں کیا ان کے ساتھ حاضر ہونا جائز ہے یا نہیں؟ فتویٰ عنایت فرما کر اجر حاصل کریں۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ یہ اشعار ہیں جو صوفیاء پڑھتے ہیں:

یا شیخُ کُفَّ عن الذُّنوبْ قبلَ التَّفرُّقِ والزَّلَلْ
واعمَلْ لنفسكَ صالحاً مادام ينفعكَ العَمَلْ
أمّا الشبابُ فقد مَضَى ومَشِيبُ رأسكَ قد نَزَلْ

جواب یہ ہے کہ صوفیاء کا مذہب باطل، جہالت اور گمراہی ہے۔ اسلام تو صرف کتاب اللہ اور رسول اللہ کی سنت کا نام ہے۔ رہا رقص اور وجد تو یہ سب سے پہلے سامری کے ساتھیوں نے کیا تھا جب اس نے ان کے لیے بچھڑے کا ڈھانچہ بنایا تھا اور اس میں سے آواز نکلتی تھی وہ اس کے ارد گرد رقص کرتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ یہ کفار کا دین ہے اور بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کا دین ہے اور رہا ڈھول بجانا تو یہ زنادقہ نے سب سے پہلے ایجاد کیا تھا تا کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو کتاب

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذہ

اللہ سے دور کریں۔ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھتے تھے تو وقار و تعظیم کی یہ کیفیت ہوتی تھی گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں (1) پس سلطان اور اس کے قائم مقام لوگوں کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو مساجد میں حاضر ہونے سے روکیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ان کے ساتھ حاضر ہونا جائز نہیں اور وہ باطل پر ان کی معاونت نہ کرے؛ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہم ائمۃ المسلمین کا مذہب ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ۝ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَسَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ۝ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَوٰةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهُ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۖ لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝ إِنَّمَا إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

''ہارون نے کہا: اے میرے ماں جائے (بھائی) نہ پکڑو میری داڑھی کو اور نہ میرے سر (کے بالوں) کو۔ میں نے اس خوف سے (ان پر سختی نہ کی) کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے پھوٹ ڈال دی بنی اسرائیل کے درمیان اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا۔ آپ نے پوچھا: اے سامری! (اس فتنہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی؛ اس نے کہا: میں نے دیکھی ایسی چیز جو لوگوں نے نہ دیکھی پس میں نے مٹھی بھر لی رسول کی سواری کے نشان قدم کی خاک سے پھر اسے ڈال دیا (اس ڈھانچہ میں) اور اس طرح آراستہ کردی میری لیے میرے نفس نے یہ بات۔ آپ نے (غصہ سے) فرمایا: جا چلا جا پس تیرے لیے اس زندگی میں تو یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے اور بیشک تیرے لیے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور (ذرا) دیکھ اپنے اس خدا کی طرف جس پر توجم کر بیٹھا رہا (اس کا کیا حشر ہوتا ہے) ہم اسے جلا ڈالیں گے پھر ہم بکھیر کر بہا دیں گے اس سمندر میں اس (کی راکھ) کو۔ تمہارا معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں گھیر رکھا ہے اس نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: دائیں ہاتھ سے سر کے بال پکڑے اور بائیں ہاتھ سے داڑھی کو پکڑا کیونکہ اللہ کی رضا کے لیے غیرت ان پر غالب آچکی تھی یعنی ایسا نہ کرو کہ لوگ خیال کریں گے کہ یہ آپ کی طرف سے استخفاف اور سزا ہے۔ بعض علماء نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بغیر استخفاف اور عقوبت کے کیا تھا جیسا کہ انسان اپنی داڑھی کو پکڑ لیتا ہے۔ یہ واقعہ سورۂ اعراف میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی

1۔ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرجل یتداوی، حدیث نمبر 3357 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مراد کو بہتر جانتا ہے۔

اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ میں نکلوں گا اور انہیں چھوڑ جاؤں گا حالانکہ آپ نے مجھے حکم دیا تھا میں ان کے ساتھ نکلوں اگر میں خود نکلتا تو قوم میری اتباع نہ کرتی اور قوم بچھڑے کے ساتھ پیچھے رہتی۔ بعض اوقات معاملہ خونریزی تک جا پہنچتا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں انہیں جھڑکوں گا تو جنگ واقع ہوگی اور پھر آپ مجھے ملامت کریں گے۔ یہ حضرت ہارون کا جواب ہے حضرت موسیٰ علیہما السلام کو جب انہوں نے کہا تھا: اَفَعَصَیۡتَ اَمۡرِیۡ سورۂ الاعراف میں ہے: اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَ کَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ ۫ۖ فَلَا تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ (الاعراف:150)

کیونکہ آپ نے حکم دیا تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ اس مفہوم پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ وَ لَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ اس کا معنی ہے تو نے ان کی حفاظت کے بارے میں میری وصیت پر عمل نہیں کیا کیونکہ آپ نے مجھے ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا تھا یہ مقاتل کا قول ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: میرے عہد اور میرے آنے کا انتظار نہیں کیا پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا پھر سامری کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: فَمَا خَطۡبُکَ یٰسَامِرِیُّ اے سامری! تیری غرض کیا تھی کس چیز نے تجھے اس پر ابھارا ہے؟ قتادہ نے کہا: سامری بنی اسرائیل میں ایک عظیم شخص تھا اس کا تعلق اس قبیلہ سے تھا جسے سامرہ کہا جاتا ہے، لیکن اس اللہ کے دشمن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سمندر پار کرنے کے بعد منافقت کی۔ جب بنی اسرائیل عمالقہ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ اپنے بتوں پر بیٹھے تھے تو بنی اسرائیل نے کہا: اے حضرت موسیٰ! ہمارے لیے ایک خدا بنا دو جیسا کہ ان کے خدا ہیں پس سامری نے موقع کو غنیمت جانا اور اس نے جان لیا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کی طرف مائل ہیں تو اس نے بچھڑا بنا دیا۔ پس سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیتے ہوئے کہا: بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ یَبۡصُرُوۡا بِہٖ میں نے ایسی چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی تھی یعنی میں نے وہ چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی میں نے جبریل کو حیاۃ کے گھوڑے پر دیکھا پس میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس کے نشان قدم سے ایک مٹھی بھر لوں پس میں نے اس کو کسی چیز پر نہیں ڈالا مگر اس کے لیے روح، گوشت اور خون بن گیا جب انہوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ ان کے لیے خدا بنا دیں تو میرے نفس نے میرے لیے یہ آراستہ کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب جبریل اترے تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف لے جائیں تو سامری نے لوگوں کے درمیان سے اسے دیکھا اور گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر لی۔ بعض نے کہا: سامری نے کہا: میں نے جبریل کو گھوڑے پر دیکھا وہ حد نظر پر قدم رکھتا تھا پس میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس کے نشان سے مٹھی بھر لوں۔ پس میں نے کسی چیز پر اسے نہیں ڈالا مگر اس کے لیے روح اور خون بن گیا۔ بعض نے کہا: اس نے جبریل کو نر گھوڑے پر نزول کے دن دیکھا۔ فرعون کا گھوڑا دریا میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ کہا جاتا ہے: سامری کی ماں نے سامری کی پیدائش کے دن اسے ایک غار میں رکھا اس خوف سے کہ کہیں فرعون اسے قتل نہ کر دے۔ پس حضرت جبریل امین اس کے پاس آئے اور سامری کی ہتھیلی کو سامری کے منہ میں رکھ دیا پس وہ شہد اور دودھ اس سے پیتا رہا۔ حضرت جبریل اس کے پاس آتے جاتے تھے تو سامری نے اسے اس وقت سے پہچان لیا تھا۔ یہ معنی سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام سنا جہاں انہوں نے موم سیم ڈھانچے بنائے تھے ایک ڈھانچہ بیل کا تھا اور دوسرا گھوڑے کا تھا۔ پھر دونوں کو دریائے نیل میں ڈال دیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کو تلاش کرنے کے لیے ایسا کیا تھا وہ پتھر کے تابوت میں دریائے نیل میں تھے تو بیل اس تابوت کو اپنے سینگ پر اٹھا لایا۔ پس سامری نے وہ کلام پڑھی جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سنی تھی پس سامری نے وہ مٹھی بھر مٹی بچھڑے کے پیٹ میں ڈالی تو وہ ڈکارنے لگا۔ حمزہ، کسائی، اعمش اور خلف نے بمالم تبصروا پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ خبر کی بناء پر پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن مسعود، الحسن اور قتادہ نے فقبصت قبصة صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے قاف کے ضمہ کے ساتھ قبصة سے پڑھا ہے، یعنی صاد بغیر نقطہ کے۔ باقی قراء نے قبضت قبضة ضاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ القبض پوری ہتھیلی کو کہتے ہیں اور القبص انگلیوں کے اطراف کو کہتے ہیں ان کی طرح الخضم والقضم ہے اقبضة قاف کے ضمہ کے ساتھ مقبوض مقدار کو کہتے ہیں؛ مہدوی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ جوہری نے قبصة فا کے ضمہ اور صاد کے ساتھ ذکر نہیں۔ انہوں نے القبضة قاف کے ضمہ اور ضاد کے ساتھ کیا ہے جو تو مٹھی میں پکڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے: أعطاه قبضة من سویق أو تمر یعنی میں نے اسے مٹھی بھر ستو یا کھجور دی۔ کبھی قاف کے فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور فرمایا: القبص قاف کے کسرہ اور صاد کے ساتھ اس کا معنی ہے لوگوں کی کثیر تعداد۔ کمیت نے کہا:

لکم مسجدا اللہ المزوران والحصی لکم قِبْصُهُ من بین أَثْرَیٰ وأَقْتَرَیٰ

فَنَبَذْتُهَا یعنی میں نے اسے بچھڑے میں ڈالا۔ وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ میرے لیے میرے نفس نے اسی طرح آراستہ کر دیا؛ یہ اخفش کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: حدثنی نفسی میرے نفس نے بیان کیا۔ دونوں قریب المعنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَاذْهَبْ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہمارے درمیان سے چلا جا۔ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ زندگی بھر تو یہی کہتا رہے گا کہ مجھے کوئی نہ چھوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنی قوم سے نکال دیا۔ اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ نہ ملیں اور نہ اس کے قریب جائیں اور نہ اس سے کلام کریں۔ یہ اس کے لیے بطور سزا تھا۔ شاعر نے کہا:

تَمِیمٌ کرهط السامری وقوله أَلَا لا یریدُ السامری مِسَاسَا

حسن نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سامری کی سزا یہ بنائی کہ لوگوں کو وہ نہ چھوئے اور نہ لوگ اسے چھوئیں، یہ اس کے لیے اور جو اس میں سے قیامت تک ہوگا سب کے لیے سزا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس پر محنت سخت کر دی کہ اسے ایسا بنا دیا کہ وہ کسی کو نہ چھوئے اور کسی کے لیے اس کو چھونا ممکن نہ تھا۔ یہ اس کے لیے دنیا میں سزا تھی۔ کہا جاتا ہے: وہ وسواس میں مبتلا کیا گیا۔ وسواس کی اصل اس وقت سے ہے۔ قتادہ نے کہا: ان کے بقیہ لوگ آج بھی ہیں جو کہتے ہیں: لا مساس اگر کوئی دوسرا ان میں سے کسی کو چھوئے تو دونوں اسی وقت بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسے قتل نہ کر دیہ سخی ہے۔ کہا جاتا ہے: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا: فَاذْهَبْ فَاِنَّ

لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ تو وہ بھاگ گیا پس وہ جنگلوں میں درندوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا وہ لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں پاتا تھا جو اسے چھوتا حتی کہ وہ اس کہنے والے کی طرح ہو گیا جو ہر وقت کہتا: لَا مِسَاسَ کیونکہ وہ لوگوں سے دور تھا اور لوگ اس سے دور تھے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

حَمَّالُ رایاتٍ بها قَنَعاسا حتی تقولَ الأزدُ لامسابسا

یہ اہل بدعت، نافرمانوں کو نکالنے اور دور کرنے کی اصل ہے اور ان سے اختلاط نہ کرنے کی اصل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب بن مالک اور پیچھے رہ جانے والے صحابہ کے متعلق ایسا کیا تھا۔ جو شخص حرم میں پناہ لے اور اس پر قتل ہو تو بعض فقہاء کے نزدیک اسے قتل نہیں کیا جائے لیکن اس کے ساتھ معاملہ نہیں کیا جائے نہ بیع کی جائے گی۔ یہ اس کو حرم سے نکلنے پر مجبور کرنا ہے۔ اس قبیل سے زنا کی حد میں جلاوطن کرنا ہے۔ یہ تمام مسائل اپنے اپنے مقام پر گزر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ وحدہ۔

ہارون القاری نے کہا: عرب کی لغت میں لَا مِسَاسَ سین کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ نحویوں نے اس میں کلام کی ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ مبنی بر کسرہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: اضرب الرجل۔ ابو اسحاق نے کہا: لَا مِسَاسَ نفی ہے سین کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ تانیث کی علامت ہے تو کہتا ہے: فعلتِ یا امرأة۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا میں نے محمد بن یزید کو یہ کہتے ہوئے سنا: جب کسی اسم میں تین علتیں ہوں تو اس کا مبنی ہونا واجب ہے جس میں دو علتیں ہو تو اس کا غیر منصرف ہونا واجب ہے کیونکہ حرف کے ترک کے بعد مبنی ہونا ہی باقی رہتا ہے۔ پس مساس اور دراک میں تین جہات سے علت ہے۔ ایک یہ کہ یہ معدول ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ مونث ہے۔ تیسرا یہ کہ یہ معرفہ ہے۔ جب اس میں بنا واجب ہے اور سین سے پہلے الف ساکن ہے تو التقاء ساکنین کی وجہ سے سین کو کسرہ دیا گیا جیسے تو کہتا ہے: اضرب الرجل۔ میں نے ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ اس قول کی طرف جانا خطا ہے۔ اور ابو اسحاق نے ابو عباس کو الزام دیا ہے کہ جب کسی عورت کا نام فرعون رکھا جائے اسے بھی مبنی ہونا چاہیے جبکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ جوہری نے الصحاح میں کہا: رہا عربوں کا قول: لَا مِسَاسَ یہ فطامِ کی مثل ہے یہ مبنی بر کسرہ ہے کیونکہ یہ مصدر سے معدول ہے اور وہ المس ہے۔ ابو حیوہ نے لامساس پڑھا ہے۔ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ یعنی قیامت کے دن۔ الموعد مصدر ہے یعنی تیرے لیے عذاب کا وعدہ ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تخلفه لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے دو معانی ہیں (۱) تو اس کے پاس آئے گا اور تو اسے وعدہ خلافی کرنے والا نہ پائے گا، جیسے تو کہتا ہے: احمدتہ میں نے اسے محمود پایا۔ (۲) دوسرا معنی تہدید کی بنا پر ہے یعنی تیرے لیے ضروری ہے کہ تو اس کی طرف جائے۔ باقی قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے کیے ہوئے وعدہ میں وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ یعنی تو اس پر قائم ہے۔ عاکفا، ملازما۔ اس کی اصل ظللت ہے۔ شاعر نے کہا:

خَلَا أنَّ العِتاقَ من المطايا أَحَسْنَ به فهنّ إليه شُوسُ

یعنی أحسَسْنَ اسی طرح اعمش نے اصل پر دو لاموں کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ظلت ظاء کے کسرہ کے ساتھ ہے کہا جاتا ہے: ظللت أفعل كذا إذا فعلته نهارا و ظَلت و ظِلت جب کوئی دن کے وقت کام کرے اور جنہوں نے ظَلت کہا پہلا لام تخفیفاً حذف کر دیا ہے اور جنہوں نے ظِلت کہا اس نے لام کی حرکت ظا کو دے دی۔ لَنُحَرِّقَنَّهٗ نون کے فتحہ اور راء کے ضمہ اور تخفیف کے ساتھ۔ یہ حرقت الشئ أحرقه حرقا کسی چیز کو ایک دوسرے سے بالکل مل دینا، پیش دینا: اسی سے عربوں کا قول ہے: حَرَقَ نابَه يحرِقه یعنی اس نے اسے پیس ڈالا حتی کہ اس کی آواز سنی گئی۔ اس قرأت کا معنی ہے ہم انہیں آرن کیا اور کوٹ دیا۔ المبرد کوٹنے کا آلہ۔ اور پہلی دو قرأتوں کا معنی ہے آگ کے ساتھ اس طرح خون بہا جس طرح عام بچھڑے کو ذبح کرنے سے خون بہتا ہے۔ پھر ہتھوڑے کے ساتھ اس کی ہڈیوں کو توڑا اور پھر جلا دیا۔ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں لنذبحنه ثم لنحرقنه ہے گوشت اور خون جب جل جاتے ہیں تو راکھ بن جاتے ہیں پھر اسے دریا میں بکھیرنا ممکن ہوتا ہے۔ رہا سونا تو وہ راکھ نہیں بنتا۔ بعض علماء نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے جس کے ساتھ سونا راکھ بن جاتا ہے۔ یہ ان کی آیات میں سے تھا۔ لَنَنْسِفَنَّهٗ کا معنی ہے ہم اسے اڑا دیں گے۔ ابورجاء نے لننسفنه سین ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ النسف کا معنی ہے کسی چیز کو جھاڑنا تاکہ ہوا اس کو اڑا لے جائے۔ اس کو انتذرية کہتے ہیں۔ المنسف جس کے ساتھ دانے صاف کیے جاتے ہیں، وہ چیز جس کا آگے والا حصہ اُٹھا ہوا ہو۔ النسافة جو اس سے نیچے گرے۔ کہا جاتا ہے: اعزل النُّسافة وكل من الخالص چھان کو دور کر اور خالص کو کھا۔ کہا جاتا ہے: اتان فلان كان لحيته منسف ہمارے پاس فلاں آیا گویا اس کی داڑھی چھانی ہے۔ ابونصر نے یہ حکایت کیا ہے: المنسفة اس آلہ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی عمارت اکھیڑی جاتی ہے۔ نسفت البناء نسفاً میں نے عمارت کو اکھیڑ دیا، نسف البعير الكلاء ينسفه سین کے کسرہ کے ساتھ۔ جب اونٹ گھاس کو جڑ سے اکھیڑ دے۔ انتسفت الشئ کا معنی ہے میں نے چیز کو اکھیڑ دیا ہے یہ ابوزید سے مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا یعنی بچھڑا معبود نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو وسیع ہے وہ ہر فعل اپنے علم سے کرتا ہے۔ عِلْمًا پر نصب تفسیر کی بناء پر ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے وسع كل شئ علماء پڑھا ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَاۗءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝ۙ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝ۚ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝ۧ

”یوں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے خبریں ان لوگوں کی جو پہلے گزر چکے اور ہم نے مرحمت فرمایا ہے آپ کو اپنی

جناب سے ایک پند نامہ۔ جو شخص روگردانی کرے گا اس سے وہ اٹھائے گا قیامت کے دن ایک بوجھ، یہ لوگ ہمیشہ اس بوجھ تلے دبے رہیں گے اور بہت تکلیف دہ ہوگا ان کے لیے روز قیامت یہ بوجھ۔ جس روز پھونکا جائے گا صور میں اور ہم جمع کریں گے مجرموں کو اس دن اس حال میں کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی، چپکے چپکے آپس میں کہیں گے کہ نہیں رہے تم دنیا میں مگر صرف دس دن۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جبکہ ان میں سب سے زیادہ زیرک کہے گا کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر صرف ایک دن"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کَذٰلِکَ کاف محل نصب میں ہے یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی کما قصصنا علیك خبر موسیٰ جس طرح ہم نے آپ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر بیان کی اسی طرح ہم سابقہ واقعات کو بیان کریں گے تاکہ آپ کے لیے باعث تسلی ہوں اور آپ کی صداقت پر دلیل ہوں۔ وَقَدْ اٰتَیْنٰکَ مِنْ لَّدُنَّا ذِکْرًا ﴿۹۹﴾ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ قرآن کو ذکر اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں نصیحت ہے اور الرسول کو بھی ذکر کہا جاتا ہے کیونکہ ذکر (نصیحت) اس پر اتاری جاتی ہے۔ بعض علماء نے کہا: اٰتَیْنٰکَ مِنْ لَّدُنَّا ذِکْرًا یعنی ذکر سے مراد شرف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَذِکْرٌ لَّكَ (الزخرف: 44) یعنی تیرے اسم کے ساتھ شرف اور عزت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ یعنی جس نے قرآن سے اعراض کیا اور قرآن پر ایمان نہ لایا اور جو احکام اس میں ہیں ان پر عمل نہ کیا۔ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ وزراً سے مراد بڑا گناہ اور بڑا بوجھ ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهِ، وہ اس بوجھ تلے ہمیشہ رہیں گے یعنی اس جزا میں اور اس کی جزا جہنم ہے۔ وَسَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ۝ برا ہے وہ بوجھ جو وہ قیامت کے روز اٹھائیں گے۔ داؤد بن رفیع نے فانہ یُحمل پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ یہ اکثر کی قرأت ہے۔ ینفخ یاء کے ضمہ کے ساتھ فعل مجہول کی بناء پر۔ ابو عمر، ابن ابی اسحاق نے معروف کا صیغہ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے ونحشر سے استدلال کیا ہے۔ ابن ہرمز سے ینفخ یاء کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے، یعنی اسرافیل پھونکے گا۔ سورۂ انعام میں اس پر بحث گزر چکی ہے۔ اور کتاب التذکرہ میں بھی اس کی بحث ہے۔ طلحہ بن مصرف نے ویحشر یاء کے ضمہ کے ساتھ اور المجرمون کو حالت رفعی میں پڑھا ہے۔ یہ مصحف کے خلاف ہے۔ اور باقی قراء نے ونحشر المجرمین پڑھا ہے۔ المجرمین سے مراد مشرک ہیں۔ زُرْقًا، یہ المجرمین سے حال ہے۔ الزرق سیاہی کا متضاد ہے۔ عرب نیلی آنکھوں کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے نیلا ہونے اور چہروں کے سیاہ ہونے کی وجہ سے ان کی خلقت ناپسندیدہ ہوگی۔ کلبی اور فراء نے زرقا کا معنی اندھا بیان کیا ہے۔ ازہری نے کہا: پیاسے ان کی شدت پیاس کی وجہ سے آنکھیں نیلی ہوں گی؛ یہ زجاج کا قول ہے، انہوں نے کہا: پیاس کی وجہ سے آنکھیں نیلی ہو جاتی ہیں اور سیاہی بدل جاتی ہے۔ بعض نے کہا: یہ جھوٹی امید ہے جب اس کے پیچھے خسارہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے: طویل انتظار کی وجہ سے میری آنکھیں سفید ہو گئیں۔ پانچواں قول یہ ہے کہ شدت خوف سے ان کی آنکھیں کھلی کھلی ہوں گی۔ شاعر نے کہا:

لقد زرقت عیناك یابنَ مُکَعْبَرٍ کما کُلُّ ضَبّیٍّ من اللؤم أزرقُ

کہا جاتا ہے: رجل ازرق العین، المرأۃ زرقاء بینۃ الزرق، اسم الزرقۃ زرقت عینہ۔ راء کے کسرہ کے ساتھ ازرقت عینہ ازرقاقا وازراقت عینۃ ازریقاقا، سعید بن جبیر نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا کے متعلق پوچھا گیا اور دوسری جگہ فرمایا: وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا (الاسراء: 97) فرمایا: قیامت کے دن کے لیے مختلف حالات ہوں گے ایک حالت میں ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی اور ایک حالت میں اندھے ہوں گے۔

يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ، الخفت کی اصل لغت میں سکون ہے پھر اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو اپنی آواز کو پست کرتا ہے اور خفیہ بات کرتا ہے۔ آیت کا مطلب ہے وہ سرگوشی کرتے ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے یعنی وہ حشر کے میدان میں ایک دوسرے سے رازداری سے چپکے چپکے بات کریں گے۔ اِنْ لَّبِثْتُمْ یعنی دنیا میں نہیں ٹھہرے۔ بعض نے کہا قبور میں نہیں ٹھہرے۔ اِلَّا عَشْرًا مراد دس راتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دو نفخوں کے درمیان کا عرصہ ہے اور وہ چالیس سال ہے اس مدت میں کفار سے عذاب بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اُٹھالیا جائے گا تو وہ اس مدت کو کم خیال کریں گے یا قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی شدت کی وجہ سے دنیا میں رہنے کی مدت کو کم خیال کریں گے اور ان میں سے جو زیادہ دانشمند اور سیانا ہوگا اور علم والا ہوگا اسے یوں محسوس ہوگا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر ایک دن یعنی دنیا میں ان کا قیام ایک دن تھا؛ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: الا مثل یوم بعض علماء نے فرمایا: وہ قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھ کر وہ دنیا کی نعمتوں کو بھول جائیں گے حتی کہ وہ انہیں ایک دن کی طرح دیکھیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک دن سے مراد نفخوں کے درمیان ٹھہرنا ہے۔ یا قبور میں ٹھہرنا مراد ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ عشرا اور یوما، لبثم کی وجہ سے منصوب ہیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝١٠٥ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝١٠٦
لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ۝١٠٧ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ
وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝١٠٨ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ
اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۝١٠٩ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۝١١٠

"اور وہ آپ سے پہاڑوں کے انجام کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمائیے: میرا رب انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دے گا، پس بنا چھوڑے گا اس پہاڑی علاقہ کو کھلا ہموار میدان، نہ نظر آئے گا تجھے اس میں کوئی موڑ اور نہ کوئی ٹیلا۔ اس روز سب لوگ پیروی کریں گے پکارنے والے کی کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اس سے اور خاموش ہو جائیں گی سب آوازیں رحمٰن کے خوف سے پس تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدہم سی آہٹ۔ اس دن نہیں نفع دے گی کوئی سفارش سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رحمٰن نے اجازت دی اور پسند فرمایا ہو اس

کے قول کو۔ وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے والے حالات کو اور ان کے گزرے ہوئے واقعات کو اور لوگ نہیں احاطہ کر سکتے اس کا اپنے علم سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ یعنی لوگ قیامت کے دن پہاڑوں کی حالت کے متعلق پوچھتے ہیں فَقُلْ یہاں فا کے ساتھ آیا ہے ہر سوال جو قرآن میں آیا ہے اس کے جواب میں قل بغیر فاء کے آیا ہے سوائے اس ایک مقام کے، کیونکہ اس کا معنی ہے اگر وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کریں تو آپ کہیں۔ تو کلام کے ضمن میں شرط کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ لوگ پہاڑوں کے متعلق سوال کریں گے پس سوال سے پہلے انہیں جواب دیا۔ یہ سوالات جو پہلے گزر چکے ہیں لوگوں نے ان کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو سوال کے بعد جواب دیا اسی وجہ سے جواب بغیر فاء کے آیا اور یہ سوال ابھی تک انہوں نے پوچھا نہیں تھا۔ يَنْسِفُهَا وہ اسے اڑاتا ہے۔ نَسْفًا ابن اعرابی وغیرہ نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ اسے جڑ سے اکھیڑے گا پھر اسے ریت کی طرح پیس ڈالے گا۔ اور پھر اسے دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح کر دے گا جنہیں ہوائیں ادھر اُدھر اڑائیں گی۔ اور فرمایا: العھن رنگی ہوئی اون کو کہتے ہیں۔ پھر بکھرے ہوئے ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔ فَيَذَرُهَا یعنی انہیں چٹیل میدان بنا دے گا۔ قَاعًا صَفْصَفًا، القاع اس زمین کو کہتے ہیں جو چٹیل ہو پس کوئی چیز نہ اگتی ہو؛ یہ ابن اعرابی کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ہموار زمین کو القاع کہتے ہیں۔ اس کی جمع اقوع واقواع وقیعان آتی ہے واو بعد کسرہ کے یاء ہوگی۔ فراء نے کہا: القاع سے مراد وہ زمین ہے جس میں پانی جمع ہوتا ہو اور الصفصف سے مراد وہ زمین ہے جس پر کوئی گھاس وغیرہ نہ ہو۔ کلبی نے کہا: وہ زمین جس پر کوئی گھاس نہ ہو۔ بعض نے کہا: ہموار زمین گویا برابری میں ایک صف کی طرح ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ القاع اور الصفصف کا ایک معنی ہے۔ القاع کھلی زمین الصفصف ہموار چٹیل زمین۔ سیبویہ نے یہ شعر بطور استشہاد پڑھا ہے:

وَكَمْ دُوْنَ بَيْنِكَ مِنْ صَفْصَفٍ وَدَكْدَاكِ رَمْلٍ وَاعْقَادِهَا

قَاعًا کو نصب حال کی بنا پر ہے۔ لَّا تَرٰى محل نعت میں ہے۔ فِيْهَا عِوَجًا ابن الاعرابی نے کہا: العوج راستے میں ٹیڑھا پن ہونا۔ الامت سے مراد ٹیلا ہے۔ ابو عمرو نے کہا: الامت سے مراد چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہیں۔ ہموار زمین جس میں نشیب و فراز نہ ہو۔ تو کہتا ہے: امتلاء فما به امتٌ وملأت القربة ملئا لا امت فيه یعنی اس میں ڈھیلا پن نہیں۔ لغت میں الامت سے مراد بلند جگہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عوجاً کا معنی میلاً ہے۔ فرمایا: الامت تسمہ کی مثل اثر، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ عوجاً سے مراد وادی ہے اور امتاً سے مراد ٹیلا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ العوج سے مراد پستی ہے اور الامت سے مراد بلند جگہ ہے۔ قتادہ نے کہا: عوجاً سے مراد پھٹن ہے اور امتا سے مراد ٹیلا ہے۔ یمان نے کہا: الامت سے مراد زمین میں دراڑیں ہیں۔ بعض نے کہا: الامت ہموار زمین میں سے یا پہاڑ میں سے نئی جگہ کا سخت ہونا اور کسی جگہ کا نرم ہونا؛ یہ صولی نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس آیت کے ساتھ مکوڑیوں کا دم کیا جاتا ہے جس کو ہمارے ہاں البواریق کہتے ہیں۔ اس کا واحد بروقة

ہے یہ جسم پر ظاہر ہوتی ہیں خصوصاً ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہیں جو کی تین لکڑیاں لے لو ہر لکڑی کی طرف میں گرہ ہو ہر گرہ کو ان مکوڑیوں کے اوپر سے گزارو اور ایک مرتبہ یہ آیت پڑھو پھر ان لکڑیوں کو کسی تر جگہ میں دفن کر دو وہ لکڑیاں جیسے ختم ہوں گی وہ مکوڑیاں بھی ختم ہوتی جائیں گی اور کوئی اثر بھی باقی نہ رہے گا۔ میں نے یہ اپنے اوپر بھی تجربہ کیا ہے اور دوسروں پر بھی میں نے اس کو نفع مند پایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یَوْمَىِٕذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ، داعی سے مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں جب وہ صور میں پھونکیں گے۔ **لَا عِوَجَ لَهٗ** وہ ان کے پکارنے سے انحراف واعراض نہیں کریں گے بلکہ اس کی طرف جلدی کریں گے اور اس سے ادھر ادھر نہ ہوں گے؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **لَا عِوَجَ لَهٗ** یعنی اس کی پکار میں کوئی کجی نہ ہوگی۔ بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ پکارنے والے کی پوری اتباع کریں گے اس میں کجی نہ ہوگی۔ مصدر مضمر ہے معنی یہ ہے کہ وہ محشر کے لیے پکارنے والے کی آواز کی اتباع کریں گے۔ اس کی مثل یہ آیت ہے: **وَ اسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ**۝ (ق) آگے آئے گا **وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ** آواز پست اور خاموش ہو جائیں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: جب حضرت زبیر کی خبر آئی تو مدینہ طیبہ کی دیواریں اور پہاڑ پست ہو گئے۔ اور ہیبت کی وجہ سے ہر زبان ساکت ہوگی۔ **لِلرَّحْمٰنِ** رحمٰن کی وجہ سے **فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا**۝، الھمس پست آواز کو کہتے ہیں؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے الحس الخفی پست آواز، حسن اور ابن جریج نے کہا: قدموں کی آہٹ کو الھمس کہتے ہیں۔ وہ آواز جو محشر کی طرف جاتے وقت قدموں کے ایک دوسرے پر لگنے کی وجہ سے پیدا ہوگی۔ زجاج کا قول ہے وھُنَّ یَمْشِینَ بِنا ھَمِیسًا۔ اونٹوں کے چلنے کی آواز۔ شیر کو الھموس کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ تاریکی میں آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ رؤبہ کا شعر ہے:

لَیْثٌ یَدُقُّ الأَسَدَ الهَمُوسَا　والأَقْهَبَیْنِ الفِیلَ والجَامُوسَا

ھمس الطعام طعام کو چبانا۔ فوہ منضم لا یوامنہ۔ راجز نے کہا:

لقد رأیتُ عجبًا مُذْ أَمْسَا　عجائزًا مثلَ السَّعالِی خَمْسَا
یأکُلْنَ ما أصنعُ هَمْسًا هَمْسَا

بعض علماء نے فرمایا: الھمس کا معنی ہونٹوں اور زبان کو حرکت دینا ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے فلاینطقون الاھمسا پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی قریب قریب ہے یعنی ان کی آواز، کلام اور قدموں کی آواز نہیں سنی جائے گی۔ (ھ، م، س) کی بناء کا اصل معنی خفاء ہے جیسا بھی اس میں تصرف ہوا ہی سے حروف مہموسہ ہیں۔ یہ دس حروف ہیں جن کا مجموعہ یہ ہے (حثہ شخص فسکت) ان کو حروف مہموسہ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ مخرج میں اعتماد کمزور ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ سانس جاری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ**، مَنْ محل نصب میں ہے پہلے سے استثناء خارج کی بنا پر یعنی لاتنفع الشفاعۃ احداً الا شفاعۃ من اذن لہ الرحمن یعنی کسی کو شفاعت نفع نہ دے گی مگر اس کی شفاعت جس کو رحمٰن اذن شفاعت فرمائے گا۔ **وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا** یعنی اللہ تعالیٰ جس کی شفاعت پر راضی ہوگا۔ بعض نے فرمایا:

اس کا مطلب ہے شفاعت اسے نفع دے گی جسے رحمن شفاعت کرنے کی اجازت دے گا اور اس کے لیے ایسا قول ہوگا جو پسندیدہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قول سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ یعنی قیامت کے امر سے وَمَا خَلْفَهُمْ امر دنیا ہے؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ جانتا ہے جس ثواب اور عقاب کی طرف لوٹیں گے۔ وَمَا خَلْفَهُمْ جو انہوں نے دنیا میں پیچھے چھوڑا پھر بعض نے فرمایا: یہ آیت تمام لوگوں کو شامل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے داعی کی اتباع کی۔ والحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴿۱۱۰﴾ بہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، یعنی کوئی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا، کیونکہ احاطہ حد کا شعور دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے پاک ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع علم ہے یعنی کوئی اس علم کا احاطہ نہیں کرتا جس کو اللہ جانتا ہے۔ طبری نے کہا: اَيْدِيْهِمْ اور خَلْفَهُمْ اور يُحِيْطُوْنَ میں ضمائر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ اللہ زیادہ جانتا ہے۔ جو فرشتوں کی عبادت کرتا ہے وہ نہیں جانتے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

"اور (فرط نیاز سے) جھک جائیں گے سب (لوگوں کے) چہرے حی وقیوم کے سامنے اور نامراد ہوا جس نے لادا اپنے (سر) پر ظلم (کا بار گراں)۔ اور جو شخص کرتا ہے نیک اعمال اور وہ ایمان دار بھی ہو تو اسے اندیشہ نہ ہوگا کسی ظلم کا یا حق تلفی کا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ یعنی چہرے جھک جائیں گے؛ یہ ابن الاعرابی وغیرہ کا قول ہے۔ اسی سے قیدی کو عان کہا جاتا ہے۔ امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

مليكٌ على عرش السَّماءِ مُهَيْمِنٌ لعِزَّتِهِ تَعْنُو الوجوهُ وتَسجدُ

اور شاعر نے کہا:

وعَنَاله وَجْهِي وخَلْقِي كلّه في الساجدين لوجهه مَشْكُورًا

جوہری نے کہا: عنا یعنو جھک گیا اور مطیع ہوا۔ اور دوسرے نے اسے جھکا دیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ کہا جاتا ہے: عنا فيهم فلان اسيرًا یعنی فلاں ان میں قیدی ہو کر رہا۔ عناه غيره تعنية کا معنی ہے اس نے اس کو روک لیا۔ العانی قیدی کو کہتے ہیں۔ وقوم عناة ونسوة عوان وعنت به امور نزلت قیدی قوم، قیدی عورتیں۔ اس کے ذریعے امور آسان ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عنت کا معنی ہے جھک گئے۔ مجاہد نے کہا: عنت کا معنی ہے خشعت۔ ذل اور خشوع میں فرق ہے اگرچہ قریب المعنی ہیں۔ ذل کا مطلب ہے ذليل النفس ہونا۔ الخشوع کا مطلب ہے صاحب طاعت کے لیے مطیع ہونا۔ کلبی نے کہا: عنت کا معنی ہے عملت کام کیا۔ عطیہ عوفی نے کہا: اس کا معنی ہے تسلیم کرنا۔ طلق بن حبیب نے کہا: اس کا مطلب ہے زمین پر سجدہ میں پیشانی اور ناک کو رکھنا۔ نحاس نے کہا: عنت الوجوه

کے دو معانی ہیں ایک یہ کہ آخرت میں چہرے جھکے ہوں گے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ فرمایا اس سے مراد رکوع و سجود کرنا اور عنت کا معنی لغت میں قہر اور غلبہ ہے۔ اسی سے ہے: فتحت البلاد عنوۃ۔ شاعر نے کہا:

فما أخذوها عَنْوَةً عن مودة ولكنْ بضربِ المَشْرَفِي استقالها

بعض علماء نے فرمایا: یہ العناء سے مشتق ہے جس کا معنی تھکنا ہے لوگوں کی جگہ چہروں کا ذکر فرمایا۔ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ، القیوم میں تین تاویلات ہیں۔ وہ مخلوق کی تدبیر کو قائم کرتا ہے۔ ہر نفس نے جو کچھ کیا اس پر وہ قائم ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے نہ وہ زائل ہوگا نہ ہلاک ہوگا۔ یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا یعنی جس نے شرک کو اٹھایا وہ خسارے میں گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ مِنَ الصّٰلِحٰتِ میں من تبعیض کے لیے ہے یعنی شیئا من الصالحت۔ بعض نے کہا: جنس کے لیے ہے۔ فَلَا يَخٰفُ ابن کثیر، مجاہد، ابن محیصن نے یخف، من یعمل کے جواب کی حیثیت سے جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یخاف پڑھا ہے۔ خبر کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے، یعنی فھو لا یخاف یا فانه لا یخاف، ظُلْمًا اس کی طاعت کے ثواب میں کمی نہ ہوگی اور اس کی سیئات میں اس پر اضافہ کیا جائے گے۔ وَلَا هَضْمًا اس کے حق میں کمی کر کے حق تلفی نہیں کی جائے، یعنی میں نے اس کے حق کو گرا دیا اور اسے چھوڑ دیا۔ هذا یھضم الطعام یعنی وہ کھانے کے بوجھ کو کم کرتا ہے۔ امرأة ضیم الکشح ایسی عورت جس کا پیٹ پتلا ہو۔ ماوردی نے کہا: ظلم اور ھضم کے درمیان فرق یہ ہے کہ ظلم کا معنی تمام حق سے روکنا ہے اور الھضم بعض حق سے محروم کرنا ہے۔ الھضم بھی ظلم ہے۔ ایک اعتبار سے فرق ہے۔ متوکل لیثی نے کہا:

إنَّ الأذلةَ واللئامَ لَمَعشَرٌ مَوْلاهُمُ المتهضم والمظلومُ

جوہری نے کہا: رجل ھضیم و مھتضم یعنی مظلوم آدمی، تھضمه یعنی اس نے اس پر ظلم کیا۔ اهتضمته جب کوئی کسی پر ظلم کرے اور اس کے حق کو توڑ دے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾

"اور اسی طرح ہم نے اتارا اس کتاب کو قرآن عربی میں اور طرح طرح سے بیان کیں اس میں گناہوں کی سزائیں تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں یا پیدا کر دے یہ قرآن ان کے دلوں میں یہ سمجھ۔ پس اعلیٰ وارفع ہے اللہ تعالیٰ جو سچا بادشاہ ہے اور نہ عجلت کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے آپ کی طرف اس کی وحی اور دعا مانگا کیجئے میرے رب (اور) زیادہ کر میرے علم کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ یعنی جس طرح ہم نے آپ کے لیے اس سورت میں بیان کیا فکذالك جعلناه قرآنا

عربیا یعنی لغت عرب میں بنایا۔ وَ صَرَّفْنَا فِیْهِ مِنَ الْوَعِیْدِ ہم نے تخویف، تہدید، ثواب اور عقاب بیان کیا۔ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ یعنی وہ الله سے ڈریں اور گناہوں سے اجتناب کریں اور اس کے عذاب سے بچنے والے ہو جائیں۔ اَوْ یُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا، ذکر سے مراد نصیحت ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد احتیاط اور تقویٰ ہے۔ بعض نے فرمایا: ذِكْرًا سے مراد شرف ہے۔ یہاں ذکر بمعنی شرف ہے جیسے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (الزخرف: 44) بعض نے فرمایا: تا کہ وہ اس عذاب سے نصیحت حاصل کریں جس کی انہیں وعید سنائی گئی ہے۔ حسن نے او نحدث نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان سے ثاء کے رفع اور جزم کے ساتھ مروی ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ جب بندوں کو اپنی عظیم نعمت کا تعارف کرانا اور قرآن کے نازل کرنے کے متعلق بتایا تو اولاد اور ند (مدمقابل) سے اپنی ذات کو پاک فرمایا۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ یعنی الله بلند و بالا ہے۔ الْمَلِكُ الْحَقُّ حق والا ہے۔ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤى اِلَیْكَ وَحْیُهٗ الله تعالیٰ نے اپنے نبی کو بتایا کہ کیسے قرآن کو حاصل کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریل کے ساتھ جلدی کرتے تھے اور جبریل کے وحی سے فارغ ہونے سے پہلے اسے پڑھتے تھے یہ آپ کا وحی کی حفاظت پر شوق تھا اور قرآن کے بھولنے کے خوف کی وجہ سے تھا۔ پس الله تعالیٰ نے آپ کو اس سے منع فرمایا اور وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ نازل فرمایا۔ یہ اس قول کی طرح ہے: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ (القیامۃ) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: اس کا مطلب ہے آپ اس کو پوری طرح ہمارے واضح کرنے سے پہلے تلاوت نہ کریں۔ بعض نے فرمایا: وَ لَا تَعْجَلْ کا معنی ہے اس کے انزال کا سوال نہ کر اس سے پہلے کہ آپ کے پاس وحی آ جائے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان کی تاویل کے بیان سے پہلے لوگوں پر نہ پڑھیں۔ حسن نے کہا: یہ ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنی بیوی کو طمانچہ مارا اور وہ عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں قصاص کا مطالبہ لے کر آئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے قصاص کا فیصلہ کر دیا تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ (النساء: 34) اسی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو الله تعالیٰ نے فرمایا: رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کا حکم فرمایا لیکن الله تعالیٰ نے اس کا انکار کیا(1)۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے من قبل ان نقضی نون کے ساتھ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور وحیہ کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۞۱۱۵

"ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد"۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ اعمش نے اس سے مختلف پڑھا ہے۔ فنسی یا کے اسکان کے ساتھ۔ اس کے دو معانی ہیں۔ چھوڑ دینا یعنی امر اور عہد کو ترک کر دیا؛ یہ مجاہد کا قول ہے، اکثر مفسرین کا قول ہے اسی سے یہ

1۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 145

قول ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ: 67) دوسرا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں سہو اور نسیان سے ہے۔ انسان سے اس نے عہد لیا اور وہ بھول گیا۔ ابن زید نے کہا: جو اس سے عہد لیا تھا وہ بھول گیا اگر اس کے لیے عزم ہوتا۔ تو اپنے دشمن ابلیس کی اطاعت نہ کرتا اس قول کی بنا پر یہ احتمال ہے کہ اس وقت میں حضرت آدم علیہ السلام کا بھول پر مؤاخذہ کیا گیا تھا اگرچہ اب ہم سے بھول کو معاف کیا گیا ہے۔ مِنْ قَبْلُ یعنی درخت سے کھانے سے پہلے کیونکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے یعنی بنی آدم کا شیطان کی اطاعت کرنا امر قدیم ہے، یعنی اگر انہوں نے عہد کو توڑا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے ہم سے عہد لیا تو وہ بھول گئے؛ یہ قشیری نے حکایت کیا ہے۔ اسی طرح طبری نے بیان کیا ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کفار میری آیات سے اعراض کرتے ہیں اور میرے رسولوں کی مخالفت کرتے ہیں اور ابلیس کی اطاعت کرتے ہیں پہلے ان کے باپ حضرت آدم نے بھی ایسا کیا تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تاویل ضعیف ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا منکرین کفار کی مثل ہونا درست نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے تاویل کی وجہ سے معصیت ہوئی تھی۔ اس قول میں نبی کی گستاخی اور نقص ہے آیت میں ظاہر یا تو یہ ہے کہ ایک واقعہ کی ابتدا ہے اس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے یا اس کا ماقبل سے تعلق ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد لیا تھا کہ وہ قرآن کو پڑھنے میں جلدی نہ کریں تو آپ کے لیے آپ سے پہلے ایک نبی کی مثال بیان کی گئی جس کے ساتھ عہد کیا گیا تھا پس وہ بھول گیا تو انہیں عتاب کیا گیا تا کہ تحذیر سخت ہو جائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد میں مبالغہ ہو جائے۔ یہاں عہد بمعنی وصیت ہے اور نسی بمعنی ترک (چھوڑ دینا) ہے یہاں نسیان کا معنی ممکن نہیں کیونکہ بھولنے والے کو سزا نہیں دی جاتی۔ العزم کا معنی ہے کسی بھی چیز میں اپنے اعتقاد پر قائم رہنا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ درخت ممنوعہ سے نہیں کھائیں گے لیکن جب ابلیس نے آپ کو وسوسہ ڈالا تو آپ کا قصد و ارادہ موجود نہ تھا اور حضرت آدم علیہ السلام سے جو عہد لیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اس درخت سے نہیں کھائیں گے اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ابلیس آپ کا دشمن ہے۔ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے فرمایا: ہم نے اسے درخت کے کھانے سے صبر کرنے والا نہ پایا اور حکم کے التزام پر مواظبت کرنے والا نہ پایا۔ نحاس نے کہا: اسی طرح لغت میں ہے کہا جاتا ہے: لفلان عزم یعنی گناہوں سے محفوظ ہونے پر صبر اور ثبات ہے حتی کہ وہ ان سے محفوظ ہے اسی سے یہ ارشاد ہے: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف: 35)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطیہ عوفی سے مروی ہے کہ جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت کرنے والا نہ پایا یعنی جس چیز سے اسے منع کیا گیا تھا اس کی حفاظت نہ کی حتی کہ بھول گئے۔ استدلال کے ترک کی وجہ سے اس کا علم نہ رہا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اگر آپ یہ درخت کھائیں گے تو ہمیشہ جنت میں رہیں گے یعنی اس نے اس درخت کو متعین کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی بات نہ مانی پھر اس نے اس درخت کی مثل کی طرف بلایا جو نہی کے عموم میں داخل تھا، حضرت آدم علیہ السلام پر واجب تھا کہ وہ اس پر استدلال کرتے اور ایسا نہ کرتے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ نہی میں داخل نہیں ہے پس آپ نے تاویل کی بنا پر کھالیا۔ وہ بھول والا شمار نہیں ہوتا جو جانتا ہو کہ یہ معصیت

ہے۔ ابن زید نے کہا: عزماً کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے امر کی محافظت کرنا۔ ضحاک نے کہا: امر کی عزیمت۔ ابن کیسان نے کہا: اصرار کرنا، گناہ کی طرف لوٹنے کو پوشیدہ نہ رکھنا۔ قشیری نے کہا: پہلا قول کلام کی تاویل کے زیادہ قریب ہے۔ اسی وجہ سے ایک قوم نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام اولوالعزم رسولوں میں سے نہ تھے اور کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا معظم نے کہا: تمام رسل اولوالعزم تھے۔ حدیث میں ہے: ''کوئی نبی نہیں تھا مگر اس نے خطا کی، خطا کا خیال گزرا سوائے یحییٰ بن زکریا کے'' (1)۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام اپنی خطا کے سبب اولی العزم سے نکل جاتے تو حضرت یحییٰ کے سوا تمام انبیاء نکل جاتے۔ ابوامامہ نے کہا: اگر بنی آدم کے حلم کو جمع کیا جائے جب سے اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور قیامت تک (جتنی پیدا ہوگی) سب کے حلم کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں حضرت آدم کے حلم کو رکھا جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کا حلم بھاری ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

''اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا (سوائے ابلیس کے) اس نے (حکم بجا لانے سے) انکار کیا۔ اور ہم نے فرمادیا: اے آدم! بیشک یہ تیرا دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ بیشک تمہارے لیے یہ ہے کہ تمہیں نہ بھوک لگے گی یہاں اور نہ تم ننگے ہو گے، اور تمہیں نہ پیاس لگے گی یہاں اور نہ دھوپ ستائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾، سورۂ بقرہ میں اس پر تفصیلاً گفتگو گزر چکی ہے۔ فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا یہ نہی ہے مطلب یہ اس کی بات نہ ماننا ورنہ تمہارے جنت سے خروج کا سبب بن جائے گا۔ فَتَشْقٰى یعنی آپ اور آپ کی بیوی دونوں علت کے برابر ہونے میں ایک ہیں۔ فتشقیا نہیں فرمایا کیونکہ معنی معروف ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام مخاطب ہیں اور وہی مقصود ہیں نیز حضرت آدم علیہ السلام حضرت حواء کے لیے محنت کرنے والے تھے اور اس کے لیے کمانے والے تھے تو شقا میں وہ خاص کیے گئے۔ بعض نے فرمایا: اخراج دونوں پر واقع ہوگا اور شقا صرف حضرت آدم پر ہوگا۔ اس سے مراد شقاوۃ البدن ہے۔ بدن کا تھکنا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ بعد میں فرمایا: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى یعنی جنت میں نہ تجھے بھوک لگے گی نہ تم ننگے ہو گے۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى آپ اس میں نہ پیاسے ہوں گے نہ دھوپ لگے گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آگاہ کیا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے جنت میں ہوگا لباس، طعام، شراب، مسکن اور اگر آپ نے وصیت ضائع کر دی اور دشمن کی اطاعت کی تو وہ تمہیں جنت سے نکال دے گا اور آپ تھکاوٹ اور اذیت برداشت کریں گے یعنی آپ بھوکے ننگے ہوں گے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2294

اور پیاسے ہوں گے اور تجھے دھوپ بھی لگے گی تم زمین کی طرف لوٹائے جاؤ گے جب جنت سے نکالے جاؤ گے۔ شقاء کے ذکر میں حضرت آدم کو خاص فرمایا: فتشقیان نہیں فرمایا، اس میں تعلیم دی کہ بیوی کا نفقہ خاوند پر ہے پس اس دن سے عورتوں کا نفقہ مردوں پر ہے۔ جب حضرت حواء کا نفقہ حضرت آدم علیہ السلام پر تھا تو اسی طرح زوجیت کے حق کی وجہ سے حواء کی بیٹیوں کا نفقہ حضرت آدم کے بیٹوں پر ہوگا۔ اس آیت میں ہمیں بتایا کہ وہ نفقہ جو عورت کے لیے خاوند پر واجب ہوتا ہے وہ چار چیزیں ہیں۔ طعام، مشروب، لباس اور مسکن۔ جب مرد عورت کو یہ چار چیز مہیا کرے تو وہ اس کے نفقہ سے عہدہ برا سمجھا جائے گا۔ اگر اس کے بعد اس پر کوئی مہربانی کرتا ہے تو وہ ماجور ہوگا یہ چار چیزیں تو عورت کے لیے ضروری ہیں کیونکہ اس کے ساتھ زندگی کا قیام ہے۔ حسن نے فتشقیٰ سے مراد دنیا کی تکلیف ہے۔ ابن آدم نہیں دیکھا جاتا مگر تھکا ہوا۔ فراء نے کہا: وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سرخ اونٹ اتارا گیا وہ اس پر کھیتی باڑی کرتے تھے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے۔ یہ وہ شقا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا گیا تو یہ پہلی شقا تھی۔ حضرت جبریل نے حضرت آدم علیہ السلام پر جنت سے دانے اتارے تھے اور کہا تھا: اے آدم! اس کو کاشت کرو اور زراعت کرو پھر حضرت آدم علیہ السلام نے کھیتی باڑی کی، فصل کو پھر کاٹا، پھر اسے گاھا پھر صاف کیا پھر اسے پیسا پھر گوندھا پھر روٹی پکائی، پھر تھکن کے بعد کھایا پھر ان کے ہاتھ سے روٹی گرتی حتیٰ کہ وہ پہاڑ کے نیچے چلی گئی حضرت آدم علیہ السلام اس کے پیچھے چلتے گئے حتیٰ کہ تھک گئے اور پیشانی پر پسینہ آگیا اور کہا: اے آدم! تیرا رزق تھکاوٹ اور مشقت کے ساتھ ہوگا اور تیری اولاد کا رزق بھی دنیا میں تیرے بعد اسی طرح ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا ھا ضمیر سے مراد جنت ہے۔ لاتظمأ کا معنی ہے پیاسا نہ ہوگا۔ الظمأ سے مراد پیاس ہے۔ وَلَا تَضْحٰى ۝ تم سورج کے سامنے نہ آؤ گے کہ تمہیں اس کی گرمی لگے کیونکہ جنت میں سورج نہیں ہے۔ وہ لمبے لمبے سائے ہیں جس طرح فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت ہوتا ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا: جنت کا دن اسی طرح ہے اور نماز فجر پڑھنے والوں کے لیے وقت کی طرف اشارہ ہے۔ ابو زید نے کہا: ضحا الطریق یضحو ضُحوا اس کا مطلب ہے راستہ ظاہر ہو گیا۔ وضَحِیت وضحیت ضَحاً (پسینہ آیا) ضَحِیت للشمس ضَحاء (ممدود) کا مطلب ہے ظاہر ہوا۔ ضحیت حاء کے فتحہ کے ساتھ۔ دونوں لغتوں میں اضحی مضارع کا صیغہ آتا ہے۔ عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

رَأَتْ رَجُلاً أَيْمَا إِذَا الشَّمْسُ عَارَضَتْ فَيَضْحَى وأَمَّا بِالعَشِيِّ فَيَخْصَرُ

حدیث میں ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سائے میں ایک شخص کو دیکھا تو آپ نے اسے فرمایا: جس کے لیے احرام باندھا ہے اس کی خاطر دھوپ میں آ۔ اسی طرح محدثین نے اَضح ہمزہ کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ اَضحیت سے مشتق ذکر کیا ہے، کیونکہ آپ نے اسے دھوپ میں آنے کا حکم دیا ہے اسی سے یہ ارشاد ہے: وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى اور بطور

استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

ضَحِيتُ له كَيْ أَستظلَّ بظلّهِ إذا الظلُّ أضحى في القيامة قَالِصَا

ابوعمرو اور کوفیوں نے سوائے عاصم کے ابوبکر کی روایت میں وانك ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ الا تجوع پر عطف کرتے ہوئے پڑھا ہے۔ اور مرفوع ہونا بھی جائز ہے اس وقت موضع پر عطف ہوگا معنی یہ ہے کہ لك أنك لا تظمأ فيها۔ باقی علماء نے استثناء کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یا ان لك پر عطف کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ۝

''پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اس نے کہا: اے آدم! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہمیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو۔ سو (اس کے پھسلانے سے) دونوں نے کھالیا اس درخت سے تو (فوراً) برہنہ ہوگئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور وہ چپکانے لگ گئے اپنے (جسم) پر جنت (کے درختوں) کے پتے اور حکم عدولی ہوگئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا۔ پھر (اپنے قرب کے لیے) چن لیا انہیں اپنے رب نے اور (عفو و رحمت سے) توجہ فرمائی ان پر اور ہدایت بخشی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ سورۂ اعراف میں یہ گزر چکا ہے۔ قَالَ یعنی شیطان نے کہا: يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى یہ کلام بالمشافہ پر دلیل ہے۔ شیطان جنت میں سانپ کے منہ میں داخل ہوا تھا جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور درخت کے تعیین کی بحث بھی گزر چکی ہے۔ اور علماء کے جو اقوال ہیں وہ بھی گزر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ۔ یہ بھی سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ فراء نے کہا: طفقا کا عربی میں معنی ہے متوجہ ہوئے۔ فرمایا: بعض علماء نے کہا: وہ انجیر کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ وَ عَصٰۤى سورۂ بقرہ میں انبیاء کے ذنوب کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ ہمارے بعض متاخرین علماء نے فرمایا: یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض سے ذنب کے وقوع کی خبر دی اور ذنوب کو ان کی طرف منسوب کیا اور انہیں اس پر عتاب بھی کیا اور خود انبیاء کرام نے اپنے بارے میں اس کی خبر بھی دی، وہ اس پر پریشان بھی ہوئے ان سے توبہ و استغفار بھی کیا یہ تمام چیزیں بہت سے مقامات پر موجود ہیں۔ یہ امور جو ان سے واقع ہوئے جہت عذر پر ہیں اور جہت خطا اور نسیان پر ہیں یا کسی تاویل کی بنا پر ہیں جو اس کی داعی تھی یہ کام غیر کی نسبت سے نیکیاں تھے اور ان کے حق میں سیئات تھے کیونکہ ان کے مناصب و مراتب بہت بلند تھے اور ان کی اقدار بہت بلند تھیں ایک کام پر وزیر کا مواخذہ ہوتا ہے

اور کو توال کو بدلہ دیا جاتا ہے اسی وجہ سے وہ قیامت کے موقف میں خوف کھائیں گے حالانکہ انہیں امن وامان اور سلامتی کا عمل ہے۔ فرمایا: یہی حق ہے کیا خوب کہا ہے حضرت جنید نے: حسنات الأبرا سیئات المقربین ابرار کی نیکیاں مقربین کی سیئات شمار ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام سے ذنوب کے وقوع پر اگرچہ نصوص قائم ہیں لیکن ان کے مناصب ومراتب میں اس سے کمی واقع نہیں ہوتی اور نہ ان کے رتبہ میں قدح کا باعث ہیں بلکہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی تلافی فرمائی اور انہیں مقام اجتباء عطا فرمایا، ہدایت کا راستہ دکھایا، ان کی مدح کی، ان کا تزکیہ کیا، انہیں مقام اصطفاء سے نوازا۔ صلوات اللہ علیہم وسلامہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا: آج ہم میں سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے ایسی بات کریں مگر یہ کہ جب انکا ذکر کریں تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے تحت کلام کریں۔ اپنی طرف سے ان کی شان میں کچھ کہنا قطعاً جائز نہیں۔ ہمارے جو قریبی آباء گزرے ہیں جو ہماری مثل ہیں ان کے بارے ہتک آمیز یا تنقیص شان والا جملہ کہنا درست نہیں تو اپنے عظیم المرتبہ نبی مکرم ومقدم باپ کے بارے میں ایسا کلام کیسے جائز ہوگا جن کا اللہ تعالیٰ نے خود عذر بیان کیا ہے اور ان کی توبہ قبول فرمائی ہے اور ان کی بخشش فرمائی ہے۔

میں کہتا ہوں: جب یہ مخلوق کے بارے میں جائز نہیں تو اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں خبر دینے، ہاتھ، انگلی، پہلو، نزول وغیرہ کا بھی ذکر بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔ ابتداءً اپنی طرف سے کچھ کہنا جائز نہیں ہے مگر کتاب اللہ کی قرابت اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ذکر کرنا جائز ہے۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں کوئی ایسا وصف بیان کیا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: **وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ** (المائدہ: 64) پس اس نے اپنے ہاتھ سے گردن کی طرف اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح سمع وبصر کی طرف اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے ساتھ تشبیہ دی ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ آئمہ نے یہ حدیث روایت کی ہے اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے آدم! تو ہمارا باپ ہے تو نے ہمیں نامراد کیا اور تو نے ہمیں جنت سے نکالا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا اے حضرت موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے کلام سے مشرف کرنے کے لیے چنا اور تیرے لیے اپنے ہاتھ سے خط کھینچا۔ اے موسیٰ! کیا تو مجھے ایسے امر پر ملامت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے مجھ پر مقدر کر دیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے'' (2)۔ یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔ مہلب نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے کا مطلب یہ حجت کے ذریعے غالب آگئے۔ لیث بن سعد نے کہا: اس واقعہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حجت صحیح تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خطا کو معاف کیا اور ان کی توبہ قبول فرمائی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے زیبا نہیں تھا کہ وہ انہیں اس خطا کی وجہ سے عار دلاتے جس کو

1۔ التمہید، جلد 7، صفحہ 145

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7387

اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا۔'' اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا تو وہ موسیٰ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا کی اور اس میں ہر چیز کا علم ہے اور تو نے اس میں پایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر معصیت کو مقدر کیا ہے اور یہ بھی کہ اس سے توبہ کو مقدر کیا ہے پس اس نے اس وجہ سے مجھ سے ملامت کو ساقط کر دیا کیا تو مجھے ملامت کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ مجھے ملامت نہیں کرتا''۔ اس کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس شخص پر حجت قائم کی تھی جس نے کہا تھا: عثمان جنگ اُحد میں بھاگ گئے تھے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اس کا کوئی گناہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا فرمایا: وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ (آل عمران: 155) بعض نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام آب (باپ) تھے۔ ان کو ان کی نیکی کی وجہ سے عار دلانا جائز نہیں۔ اگر کسی دوسرے کو اس کے ساتھ عار دلانا جائز بھی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے بارے میں فرمایا: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان: 15) اسی وجہ سے حضرت ابراہیم کو ان کے اب یعنی چچا نے کہا تھا جو کافر تھا:

لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ (مریم)

جب ایک کافر کو نازیبا کلمہ کہنا جائز نہیں تو پھر وہ باپ جو نبی بھی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مقام انبیاء پر فائز فرمایا ہے ان کی توبہ قبول کی ہے اور راہ ہدایت دی ہے۔ (اس کی شان میں نازیبا کلمہ کہنا کیسے جائز ہوگا)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس نے کوئی خطا کی اور اس کو مغفرت کا مژدہ نہیں ملا تو علماء کا اجماع ہے کہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کی حجت کی طرح حجت نہیں پکڑنی چاہیے کہ وہ کہے: تو مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے قتل کیا ہے یا زنا کیا یا چوری کی جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ مقدر کیا تھا۔ اور امت کا اجماع ہے کہ نیکی کرنے والے کی نیکی کی تعریف کی جائے اور برائی کرنے والے کو برائی پر ملامت کی جائے اور اس کے گناہوں کو شمار کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَغَوٰى اس کا معنی ہے اس نے اپنی زندگی کو خراب کر دیا؛ یہ نقاش نے حکایت کیا ہے اور قشیری نے اس کو پسند کیا ہے میں نے اپنے شیخ استاذ المقری ابو جعفر قرطبی کو یہ کہتے ہوئے سنا: فَغَوٰى دنیا کی طرف اترنے کے ساتھ اپنی زندگی کو خراب کر دیا۔ الغی کا معنی فساد ہے۔ یہ اچھی تاویل ہے اور جنہوں نے غوی کا معنی ضل کیا ہے۔ ان کی تاویل سے یہ تاویل اولیٰ ہے۔ ضل معنی کرنے والوں نے اسے الغی سے مشتق کیا ہے جس کا معنی رشد کی ضد ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اپنے رشد کی جگہ سے ناواقف رہا، یعنی آپ کو معلوم نہ ہوا کہ یہ درخت بھی ان درختوں سے ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔ الغی کا معنی الجھل ہے۔ بعض سے مروی ہے: فَغَوٰى کا معنی ہے کثرت اکل سے بدہضمی ہوئی۔ زمخشری نے کہا: یہ ان کی لغت پر صحیح ہے جو یاء ماقبل مکسور کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ فنِی اور بقِی میں فنیٰ اور بقیٰ کہتے ہیں یہ بنو طے کی لغت ہے۔ یہ تفسیر خبیث ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قشیری ابو نصر نے کہا: ایک قوم نے کہا: کہا جاتا ہے عصی آدم وغوی عاص اور غاو نہیں کہا جاتا جیسا کہ جو ایک مرتبہ کپڑا سیے تو کہا جاتا ہے: خاط (اس نے سیا) اسے خیاط نہیں کہا جاتا جب تک بار بار خیاطت کا عمل نہ کرے۔ بعض نے کہا: سردار کے لیے اپنے غلام کو معصیت کے وقت کہنا جائز ہوتا ہے غیر کے لیے اسے وہ کہنا جائز نہیں ہوتا۔

یہ تکلف ہے اور جو انبیاء کرام کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ یا تو صغائر ہیں یا ترک اولیٰ ہے یا نبوت سے پہلے کے اعمال ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بہتر ہے۔ امام ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام سے یہ کام نبوت سے پہلے ہوا تھا اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى، اجتباء اور ہدایت، عصیان کے بعد تھے۔ جب یہ نبوت سے پہلے تھا تو ان پر ایک وجہ سے ذنوب بھی جائز ہیں کیونکہ نبوت سے پہلے ہم پر ان کی تصدیق میں کوئی حکم نہیں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مخلوق کی طرف بھیجا جبکہ وہ پیغام کی ادائیگی میں مامون تھے اور معصوم تھے تو پہلے ذنوب نے انہیں کوئی نقصان نہ دیا۔ یہ عمدہ بحث ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

"حکم ملا: دونوں اتر جاؤ یہاں سے اکٹھے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو وہ نہ بھٹکے گا اور نہ بدنصیب ہوگا۔ اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لیے زندگی (کا جامہ) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! کیوں اٹھایا ہے تو نے مجھے نابینا کر کے میں تو (پہلے بالکل) بینا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری آیتیں سو تو نے انہیں بھلا دیا اسی طرح آج تجھے فراموش کر دیا جائے گا۔ اور یونہی ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جس نے حد سے تجاوز کیا اور ایمان نہ لایا اپنے رب کی آیتوں پر، اور (سن لو) آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیر پا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا حضرت آدم و ابلیس کو خطاب فرمایا۔ مِنْهَا جنت سے۔ ابلیس کو فرمایا: اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (الاعراف: 18) شاید اسے جنت سے آسمان کی کسی جگہ پر نکلنے کا حکم دیا پھر اسے زمین کی طرف اتارا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ یہ سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یعنی تو سانپ اور ابلیس کا دشمن ہوگا اور وہ تیرے دشمن ہوں گے۔ یہ دلیل ہے کہ اهْبِطَا آدم و حواء کو خطاب نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے۔ حضرت آدم کا اترنا حضرت حواء کے اُترنے کے ضمن میں ہے۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى رشد اور سچی بات مراد ہے سورہ بقرہ میں یہ بھی گزر چکا ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ یعنی جس نے رسل اور کتب کی پیروی کی۔ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ضمانت دی ہے جو قرآن پڑھے گا اور اس کے احکام پر عمل کرے وہ دنیا میں گمراہ نہ ہوگا اور آخرت

میں بدبخت نہ ہوگا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس میں موجود احکام کی اتباع کی تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے ہدایت دے گا اور قیامت کے روز بُرے حساب سے اسے بچالے گا پھر یہ آیت پڑھی: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ یعنی میرے دین سے میری کتاب کی تلاوت سے اور اس کے احکام پر عمل سے اعراض کیا۔ بعض نے فرمایا: ذِكْرِيْ سے مراد وہ دلائل ہیں جو اتارے گئے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ذکر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں کیونکہ آپ کی طرف سے نصیحت ہے۔ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا تنگ زندگی۔ کہا جاتا ہے: منزل ضنك وعیش ضنك اس میں واحد، تثنیہ، مذکر، مونث جمع برابر ہے۔ عنترہ نے کہا:

إنْ يُلحقوا أكْرُرْ وإنْ يَستلحمُوا   أَشْدُدْ وإنْ يُلْفَوْا بِضَنْكٍ أنزِلِ

شاعر نے کہا:

إن المنيةَ لو تُمثَّل مُثِّلت   مثلي إذا نَزَلُوا بِضَنْكِ المنزلِ

اور ضنکی بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے دین کے ساتھ تسلیم، قناعت، اس پر توکل اور اس کی تقسیم پر راضی ہونا عطا کیا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے سخاوت و سہولت کے ساتھ خرچ کرتا ہے وہ بلند زندگی گزارتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل: 97) جو شخص دین سے اعراض کرتا ہے اس پر حرص غالب آجاتی ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ دنیا کی زیادتی کا لالچ کرتا رہتا ہے اس پر بخل کو مسلط کیا جاتا ہے جو اس کو خرچ کرنے سے روکتا ہے پس اس کی زندگی تنگ ہوتی ہے اور اس کا حال تاریک ہوتا ہے، جیسا کہ بعض نے فرمایا: اپنے رب کے ذکر سے اعراض نہیں کرتا مگر جس پر وقت تاریک ہوتا ہے اور رزق کے بارے میں پریشان ہوتا ہے اس کی زندگی تنگ ہوتی ہے۔ عکرمہ نے کہا: ضَنْكًا سے مراد حرام کمائی ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد کانٹے اور جھاڑی اور زقوم کا درخت ہے۔ چوتھا قول یہ ہے جو کہ صحیح ہے کہ اس سے مراد عذاب قبر ہے۔ ابو سعید خدری اور حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ قول ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً اس قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب التذکرہ میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کافر پر اس کی قبر تنگ ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہوجاتی ہیں۔ یہ معيشة ضنكا ہے۔

وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى بعض علماء نے فرمایا: ایک حال میں اندھا ہوگا اور ایک حال میں بینا ہوگا۔ سورۂ سبحان کے آخر میں یہ گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ حجت پیش کرنے سے اندھا ہوگا؛ یہ مجاہد کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ خیر کی جہات سے اندھا ہوگا کسی خیر کی طرف ہدایت نہ پائے گا۔ بعض نے فرمایا: اپنے آپ سے عذاب دور کرنے کے حیلہ سے اندھا ہوگا جیسے وہ اندھا بے بس ہوتا ہے جسے کچھ نظر نہیں آتا۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى یعنی کس گناہ کی وجہ سے مجھے اندھا ہونے کی سزا دی؟ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا دنیا میں میں بینا تھا۔ گویا اس کا گمان ہوگا کہ اس کا کوئی گناہ نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے مجھے حجت سے کیوں اندھا کر کے اٹھایا حالانکہ میں دنیا میں حجت کو جاننے والا تھا۔ قشیری نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ کافر کے لیے دنیا میں

کوئی حجت نہیں۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا یعنی اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: ہماری وحدانیت اور قدرت پر ہماری نشانیاں تیرے پاس آئیں۔ فَنَسِيْتَهَا تو نے انہیں چھوڑ دیا اور تو نے ان کی طرف نہیں دیکھا اور تو نے ان سے اعراض کیا۔ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى تو عذاب میں آج چھوڑا گیا ہے مراد جہنم ہے۔ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ جس طرح ہم نے قرآن سے اعراض کرنے والے اور مصنوعات میں غور وفکر نہ کرنے والے اور معصیت میں حد سے تجاوز کرنے والے کو جزا دی، وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ اپنے رب کی آیات کی تصدیق نہیں کی۔ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ آخرت کا عذاب معیشت ضنک اور عذاب قبر سے زیادہ خوفناک ہے۔ وَ اَبْقٰى دائمی عذاب ہے کیونکہ وہ ختم نہیں ہوگا۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

”کہا: (یہ بات) انہیں راہ راست نہ دکھا سکی کہ کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے (بداعمالیوں کے باعث) ان سے پہلے برباد کردیا چلتے پھرتے ہیں یہ لوگ جن کے (اجڑے ہوئے) مکانوں میں اس میں (ہماری قدرت) کی نشانیاں ہیں دانش مندوں کے لیے۔ اور اگر ان کے (انجام کے) متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا اور ان کے لیے ایک وقت مقرر نہ کردیا گیا ہوتا تو ابھی ان پر عذاب نازل ہوجاتا۔ پس (اے حبیب!) صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانیوالی) باتوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے لمحوں میں اس کی پاکی بیان کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ آپ خوش رہیں“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ اس سے مراد اہل مکہ ہیں یعنی کیا ان کے لیے ان کی خبر واضح نہیں ہوئی جن کو ہم نے تباہ کردیا ہے۔ یہ ان کے مکانوں کے درمیان چلتے ہیں جب طلب معاش میں تجارت کے لیے سفر کرتے ہیں اور گزشتہ قوموں کے شہروں کو دیکھتے ہیں اور چھتوں کے بل گری پڑی بستیوں کو دیکھتے ہیں یعنی کیا وہ نہیں ڈرتے اس عذاب سے کہ ان پر بھی ویسا عذاب اترے جو ان سے پہلے کفار پر اترا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسلمی وغیرہما نے نهد لهم نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ زیادہ واضح ہے۔ یهد یاء کے ساتھ فاعل کی وجہ سے مشکل ہے۔ کوفیوں نے کہا: کم فاعل ہے۔ نحاس نے کہا: یہ خطا ہے کیونکہ کم استفہامیہ میں اس کا ماقبل اس میں عمل نہیں کرتا۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے جن کو ہم نے ہلاک کیا ان کی ہلاکت کا امر ان کے لیے واضح نہیں ہوا۔ یهد کی حقیقت ہدایت پر دلالت کرتی ہے اور فاعل الهدیٰ ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: افلم یهد الهدیٰ لهم۔ زجاج نے کہا: کم محل نصب میں ہے اور اس کا ناصب أهلكنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے یعنی تیرے رب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر عذاب لازم ہو جاتا۔ قتادہ کا قول ہے: اللزام کا مطلب ملازمت ہے یعنی انہیں عذاب لازم ہوتا۔ کان کا اسم مضمر ہے۔ زجاج نے فرمایا: وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾، اس کا عطف کلمہ پر ہے۔ قتادہ نے کہا: مراد قیامت ہے۔ یہ قتبی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ان کا بدر کے دن تک مؤخر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ان کی باتوں پر صبر کا حکم دیا ہے۔ وہ کبھی کہتے: جادوگر ہے، کبھی کہتے: کاہن ہے، کبھی کہتے: کذاب ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ ان کی پرواہ نہ کریں کیونکہ ان کے لیے عذاب کا وقت مقرر ہے وہ نہ مقدم ہوگا نہ مؤخر ہوگا۔ پھر بعض نے فرمایا: یہ آیت، آیت قتال سے منسوخ ہے بعض نے فرمایا: منسوخ نہیں ہے کیونکہ آیت قتال کے بعد کفار کو جڑ سے ختم نہیں کیا گیا بلکہ ان میں بڑے بڑے بچ بھی گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ پانچ نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے مراد صبح کی نماز ہے۔ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا سے مراد عصر کی نماز ہے۔ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مراد عشاء کی نماز ہے۔ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ سے مراد مغرب اور ظہر کی نماز ہے کیونکہ ظہر دن کے پہلے حصہ کے آخر میں، دوسرے حصہ کی ابتدا میں ہوتی ہے یہ دن کی دونوں طرفوں میں ہے۔ تیسری طرف سورج کا غروب ہے اور وہ مغرب کا وقت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ زوال ان میں حد فاصل ہے ہر حصہ کی دو طرفیں ہیں زوال کے وقت دو طرفیں ہیں۔ پہلے حصہ سے آخری حصہ اور دوسرے حصہ سے پہلا حصہ۔ طرفین کی جگہ اطراف ذکر فرمایا جیسا کہ فرمایا: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم: 4) اس کی طرف ابن فورک نے المشکل میں اشارہ کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: النہار جنس کے لیے ہے ہر دن کی ایک طرف ہے اور وہ جمع کے معنی میں ہے کیونکہ وہ ہر دن کی طرف راجع ہے۔ اٰنَآئِ الَّيْلِ رات کی گھڑیاں۔ الاناء کا واحد انیٌ، انیٌ، اَنًی۔ ایک فرقہ نے کہا: اس آیت سے مراد نفلی نماز ہے؛ یہ حسن کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾، تا کے فتحہ کے ساتھ تا کہ آپ کو ان پسندیدہ اعمال پر ثواب دیا جائے۔ کسائی اور ابو بکر نے عاصم سے روایت کر کے ترضیٰ تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تجھے وہ عطا کیا جائے جو تجھے خوش کرے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

''اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھیے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب و زینت ہے دنیوی زندگی کی (اور انہیں اس لیے دی ہیں) تا کہ ہم آزمائیں انہیں ان سے اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اور حکم دیجیے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی پابند رہیے اس پر، نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو، اور اچھا انجام

پرہیزگاری کا ہی ہوتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ اس کا معنی سورۃ الحجر میں گزر چکا ہے۔ ازواجاً، متعنا کا مفعول ہے۔ زهرة حال کی بنا پر منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: زهرة، متعنا کے معنی کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس کا معنی ہے، جعلنالهم الحياة الدنيا زهرة یا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور وہ جعلنا فعل ہے یعنی جعلنا لهم زهرة الحياة الدنيا۔ زجاج سے بھی یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بہ کی ضمیر کے مقام سے بدل ہے جیسے کہ تو کہتا ہے: مررت به اخاك۔ فراء نے حال کی بنا پر منصوب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں عامل متعنا ہے۔ فرمایا: تو کہتا ہے: مررت به السکین اور اس کی تقدیر یہ ہے، متعنا هم به زهرة فی الحياة الدنيا وزينة فيها اور صنع الله کی طرح مصدر کی بنا پر منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ اسی طرح وعد الله ہے۔ اس ترکیب میں نظر ہے۔ بہتر یہ ہے کہ حال کی بنا پر نصب ہو۔ اور تنوین کے سکون اور الحياة کے لام کی سکون کی وجہ سے حذف ہو جیسے: وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یٰسین: 40) پڑھا ہے۔ نهار پر نصب سابق کی وجہ سے اس تقدیر پر کہ اس کے سکون اور لام کے سکون کی وجہ سے تنوین حذف ہے۔ اور الحياة ما سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ولا تمدن عينيك الى الحياة الدنيا زهرة یعنی فی حال زهرتها اور زهرة کو ما سے بدل بنانا اچھا نہیں کیونکہ لنفتنهم، متعنا کے متعلق ہے اور زهرة الحياة الدنيا سے مراد نباتات کے ساتھ اس کی زینت ہے۔ الزهرة ہاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کلیاں ہیں۔ اور الزهر زاء کے ضمہ اور ہاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ستارہ ہے اور بنو زہرہ ہاء کے سکون کے ساتھ ہے؛ یہ ابن عزیز کا قول ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے زهرة ہا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جیسے نهر اور نهَر اور کہا جاتا ہے: سراج زاهر یعنی اس کے لیے چمک ہے۔ زهر الاشجار۔ درختوں کے رنگ جو چمکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازهر اللون تھے، یعنی چمکدار رنگ والے تھے۔ ہر روشن چیز ہے یعنی زہرا ہے اور یہ خوبصورت ترین رنگ ہے۔ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ یعنی ہم انہیں آزمائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم اس کو ان کے لیے فتنہ بنا دیں گے۔ آیت کا معنی ہے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی چمک کو آپ کافی اہمیت نہ دیں کیونکہ اس کے لیے کوئی بقا نہیں ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ یہ لاتنظرن سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ جو نظر کو لمبا کرتا ہے اسے اس پر حرص ابھارتی ہے جو اس کے ساتھ متصل ہے اور جو صرف دیکھتا ہے کبھی اس کے ساتھ حرص متصل نہیں ہوتی۔

مسئلہ: بعض لوگوں نے کہا: اس آیت کے نزول کا سبب وہ روایت ہے جو حضرت ابورافع نے روایت کی ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے انہوں نے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک یہودی کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ اسے کہنا: "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک مہمان آیا ہے اور ہمارے پاس اس کی خوراک کے لیے کچھ نہیں ہے تو مجھے اتنا آٹا بیچ دے" یا فرمایا: "رجب کے چاند تک ادھار دے دے"۔ یہودی نے کہا: نہیں مگر رھن کے ساتھ دوں گا۔ حضرت ابورافع نے کہا: میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ کر آیا تو میں نے آپ کو اس کی بات بتائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں آسمان میں امین ہوں، زمین میں امین ہوں اگر وہ مجھے ادھار دے یا بیچ دے تو میں

اسے ادا کردوں گا تو میری اس کے پاس یہ زرہ لے جا'' (اور رہن رکھ دے) تو اللہ نے اپنے محبوب کو دنیا کے نہ ہونے پر تسلی دینے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ سبب ہونے پر اعتراض ہے کیونکہ یہ سورۂ مکی ہے اور یہ واقعہ مدنی ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخر میں پیش آیا کیونکہ آپ کا وصال ہوا تو اس واقعہ کی وجہ سے آپ کی زرہ ابھی اس یہودی کے پاس رہن تھی (1)۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت کا ماقبل کے ساتھ اتصال ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ امتوں سے عبرت حاصل نہ کرنے پر کفار کو زجر و توبیخ فرمائی پھر انہیں موجل عذاب کی دھمکی دی پھر اپنے نبی کو ان کی حیثیت کو حقارت سے دیکھنے کا حکم دیا اور ان کی اذیت ناک باتوں پر صبر کرنے کا حکم دیا اور ان کے اموال سے اعراض کرنے اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے منہ پھیرنے کا حکم دیا کیونکہ یہ تمام چیزیں ان سے ختم ہونے والی ہیں، رسوائی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح جو روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی المصطلق کے اونٹوں کے پاس سے گزرے تو موٹاپے کی وجہ سے ان کے دودھ اور مینگنیاں ان کی رانوں پر خشک ہو چکی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے سے پردہ کر لیا اور آگے گزر گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی، وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى یعنی صبر پر اور دنیا کی طرف کم توجہ پر اللہ تعالیٰ کا ثواب اولیٰ ہے کیونکہ وہ ثواب باقی رہنے والا ہے اور دنیا فنا ہونے والی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس رزق سے مراد وہ شہر اور اموال غنیمت ہیں جو اللہ تعالیٰ مومنین کو فتح کی صورت میں عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں کہ وہ نماز پر دوام اور ملازمت اختیار کریں۔ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس کے عموم میں تمام امت داخل ہے اور آپ کے اہل بیت بالخصوص داخل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد ہر صبح حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے گھر جاتے تھے اور کہتے تھے: الصلوۃ (2) (یعنی نماز کے لیے انہیں جگاتے تھے اور نماز کا حکم دیتے تھے) روایت ہے کہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب سلاطین کی اخبار میں کوئی چیز دیکھتے تھے تو فوراً اپنے گھر میں داخل ہو جاتے تھے اور یہ پڑھتے تھے: وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴰ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ پھر نماز کے لیے اس طرح ندا دیتے تھے: الصلوۃ یرحمکم اللہ اور نماز پڑھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر والوں کو نماز تہجد کے لیے جگاتے تھے اور خود نماز پڑھتے تھے اور اس آیت پر عمل کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا یعنی ہم تجھ سے سوال نہیں کرتے کہ تو اپنے آپ کو اور انہیں رزق دو اور رزق کے سبب نماز سے غافل ہو جاؤ بلکہ تمہارے اور ان کے رزق کے ہم کفیل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوتے تو نماز کا حکم دینے میں سختی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ

1۔ ترمذی، باب ما جاء فی الرخصۃ فی الشراء، حدیث نمبر 1136، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ احزاب، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَمَآ اُرِیۡدُ اَنۡ یُّطۡعِمُوۡنِ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ (الذاریات)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰی۝ یعنی اہل تقویٰ کے لیے جنت ہے، یعنی اچھا انجام۔ کبھی تقویٰ اختیار نہ کرنے والوں کے لیے انجام ہوتا ہے لیکن وہ مذموم ہوتا ہے، یہ معدوم کی طرح ہوتا ہے۔

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا یَاۡتِیۡنَا بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی۝۱۳۳ وَ لَوۡ اَنَّاۤ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِعَذَابٍ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَقَالُوۡا رَبَّنَا لَوۡ لَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَیۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَ نَخۡزٰی۝۱۳۴ قُلۡ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوۡا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَ مَنِ اهۡتَدٰی۝۱۳۵

"اور کفار کہتے ہیں کہ (یہ نبی) کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب کے پاس سے (ان سے پوچھو) کیا نہیں آگیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی نازل شدہ کتابوں میں ہے۔ اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس سے پہلے تو کہتے: اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تاکہ ہم پیروی کرتے تیری آیتوں کی اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوئے (اے حبیب!) آپ انہیں فرمائیے ہر شخص (انجام کا) منتظر ہے سو تم بھی انتظار کرو تم عنقریب جان لو گے کون ہیں سیدھی راہ (پر چلنے) والے اور کون ہدایت یافتہ ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا یَاۡتِیۡنَا بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ یہ کفار مکہ نے کہا: یعنی ہمارے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کوئی ایسی نشانی نہیں لے آیا جو علم ضروری کو ثابت کرتی یا کوئی ایسی آیت جو ظاہر ہوتی جیسے ثمود کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا یا کیوں نہ ایسی نشانیاں لے آیا جو ہم تجویز کرتے ہیں جس طرح ان سے پہلے انبیاء لے کر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوَ لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی۝ صحف اولیٰ سے مراد تورات، انجیل اور پہلی کتب ہیں۔ یہ بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ جو کچھ ان میں ہے ان کی آپ نے خبر دی۔ الصحف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا ان کے پاس وہ نشانی نہیں آئی جو آپ کی نبوت پر دلالت کرتی ہے جس کو انہوں نے سابقہ کتب میں بشارت کے طور پر پایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے کیا ان کے پاس سابقہ امتوں کے کفار کو ہمارا ہلاک کرنا پہنچ نہیں چکا جو آیات تجویز کرتے تھے کونسی چیز انہیں امن دینے والی ہے کہ ان کے پاس اگر آیات آئیں تو ان کا حال ان کفار کی حالت جیسا نہ ہوگا۔ ابو جعفر، شیبہ، نافع، ابو عمرو، یعقوب، ابن اسحاق اور حفص نے أولم تاتھم تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ بینة مونث ہے باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے فعل کے مقدم ہونے کی وجہ سے۔ نیز بینة سے مراد بیان اور برہان ہے پس انہوں نے اس کو معنی کی طرف لوٹایا۔ ابو عبید اور حاتم نے اس کو اختیار کیا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے: اَوَ لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَیِّنَةٌ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی اور کہا: بَیِّنَةٌ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی اس بنا پر جائز ہے۔ نحاس نے کہا: جب تو بینة کو تنوین دے اور رفع دے گا تو ما

کواس سے بدل بنائے گا اور جب تو اسے نصب دے گا تو حال کی بنا پر ہوگا مطلب یہ ہوگا: اولم یاتہم مانی الصحف الاولی
مبیناً کیا نہیں آچکا جو پہلے صحیفوں میں ہے جبکہ وہ بیان کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ
مِّنْ قَبْلِهٖ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پہلے۔ لَقَالُوْا قیامت کے روز کہیں گے۔ رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ
اِلَيْنَا رَسُوْلًا یعنی کیوں نہ ہماری طرف رسول بھیجا۔ فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى، اس کو نُذَلّ ونُخزی مجہول
کے صیغے بھی پڑھے گئے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زمانہ فترہ
میں ہلاک ہونے والے، پاگل کہے گا میرے پاس نہ کتاب آئی اور نہ رسول آیا پھر یہ تلاوت کی۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ
مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا... الخ، اور پاگل کہے گا: اے میرے پروردگار! تو نے میرے لیے عقل ہی نہیں بنائی جس کے ساتھ میں خیرو
شر کو سمجھتا اور مولود (بچہ) کہے گا: اے میرے رب! میں نے عمل کا زمانہ پایا ہی نہیں۔ پس ان کے لیے آگ بلند کی جائے گی
اور اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا: اس میں اترو اور داخل ہو جاؤ''۔ فرمایا: ''جو علم الٰہی میں سعید ہوگا اگر وہ عمل کو پاتا وہ اس میں داخل
ہو جائے گا اور جو علم الٰہی میں شقی ہوگا اگر وہ عمل کو پاتا وہ رک جائے گا''۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی پھر
اگر میرے رسول تیرے پاس آتے تو تم کیسے اتباع کرتے''(1)۔ حضرت ابوسعید سے موقوف بھی مروی ہے۔ اس میں نظر
ہے۔ ہم نے اس کو کتاب التذکرہ میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ان علماء نے حجت پکڑی ہے جو کہتے ہیں کہ بچے اور
دوسرے لوگ آخرت میں آزمائے جائیں گے۔ فَنَتَّبِعَ کو نصب تخصیص کے جواب کے ساتھ ہے۔ اٰيٰتِكَ سے مراد وہ
آیات ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ عذاب میں ذلیل ہونے سے پہلے۔ وَنَخْزٰى اور
جہنم میں رسوا ہونے سے پہلے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ دنیا میں
عذاب میں ذلیل ہونے سے پہلے۔ وَنَخْزٰى آخرت میں اس کے عذاب میں رسوا ہونے سے پہلے۔ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ
اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرمائیے ہر ایک منتظر ہے یعنی مومنین اور کفار گردش زمانہ کے منتظر ہیں۔ اور ہر شخص اس کا منتظر ہے کہ
کامیابی کس کے لیے ہوتی ہے؟

فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ۝۱۳۵، اس سے مراد دین مستقیم اور ہدایت ہے
مطلب یہ ہے کہ تم نصرت کے ساتھ جان لو گے کہ کون دین حق کی طرف جانے والا ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: تم قیامت کے
روز جان لو گے کون جنت کے راستہ کا ہدایت یافتہ تھا؟ اس میں وعید، تخویف اور تہدید کی ایک صورت ہے اس کے ساتھ سورت
کا اختتام کیا۔ فسوف تعلمون بھی پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابورافع نے کہا: میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو یاد کیا تھا؛ یہ
زمخشری نے ذکر کیا ہے۔ من زجاج کے نزدیک محل رفع میں ہے اور فراء نے کہا: محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے، جیسے وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرہ: 220) ابواسحاق نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ استفہام میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا اور من
یہاں استفہامیہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے معنی یہ ہے تم سیدھے راستہ والوں کو جان لو گے ہم یا تم؟ نحاس

1۔ التمہید ابن عبد البر، جلد 18، صفحہ 127۔ ابن عبد البر آخر میں کہتے ہیں ان روایات کی اسناد ضعیف ہیں۔

نے کہا: فراء اس مفہوم کی طرف گئے ہیں من اصحاب الصراط السوی من لم یضل یعنی کون سیدھے راستے والے ہیں جو گمراہ نہیں ہوئے اور مَنِ اهْتَدٰی جو گمراہ ہوا پھر ہدایت پائی۔ یحییٰ بن یعمر، عاصم جحدری نے فسیعلمون من أصحاب الصراط السوّی پڑھا ہے، یعنی واو کی تشدید کے ساتھ اور اس کے بعد الف تانیث فعلی کے وزن پر بغیر ہمزہ کے۔ الصراط کی تانیث شاذ اور قلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ (الفاتحہ) اس آیت میں اور دوسری کئی آیات میں صراط مذکر آیا ہے۔ ابو حاتم نے اس کا رد کیا ہے فرمایا: اگر یہ السوء سے ہے تو السوءی کہنا واجب ہے اگر یہ السواء سے ہو تو السِّیا سین کے کسرہ کے ساتھ، اس کی اصل السِّویا ہے۔ زمخشری نے کہا: السّواءِ بمعنی وسط اور عدل یا المستوی پڑھا گیا ہے۔ نحاس نے کہا: یحییٰ بن یعمر اور جحدری کی قرأت کا جواز یہ ہے کہ اصل السوءی ہو اور ساکن مانع نہیں گویا ہمزہ کو ضمہ سے بدلا گیا پھر ضمہ کو واو سے بدلا گیا جس طرح واو کو الف سے بدلا جاتا ہے جب اس کا ماقبل فتحہ ہو۔ والحمد للہ وحدہٗ۔